www.urducouncil.nic.in

اکتوبر 2016، **قیمت:- /10₹**

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly **BACHON KI DUNIYA**, New Delhi

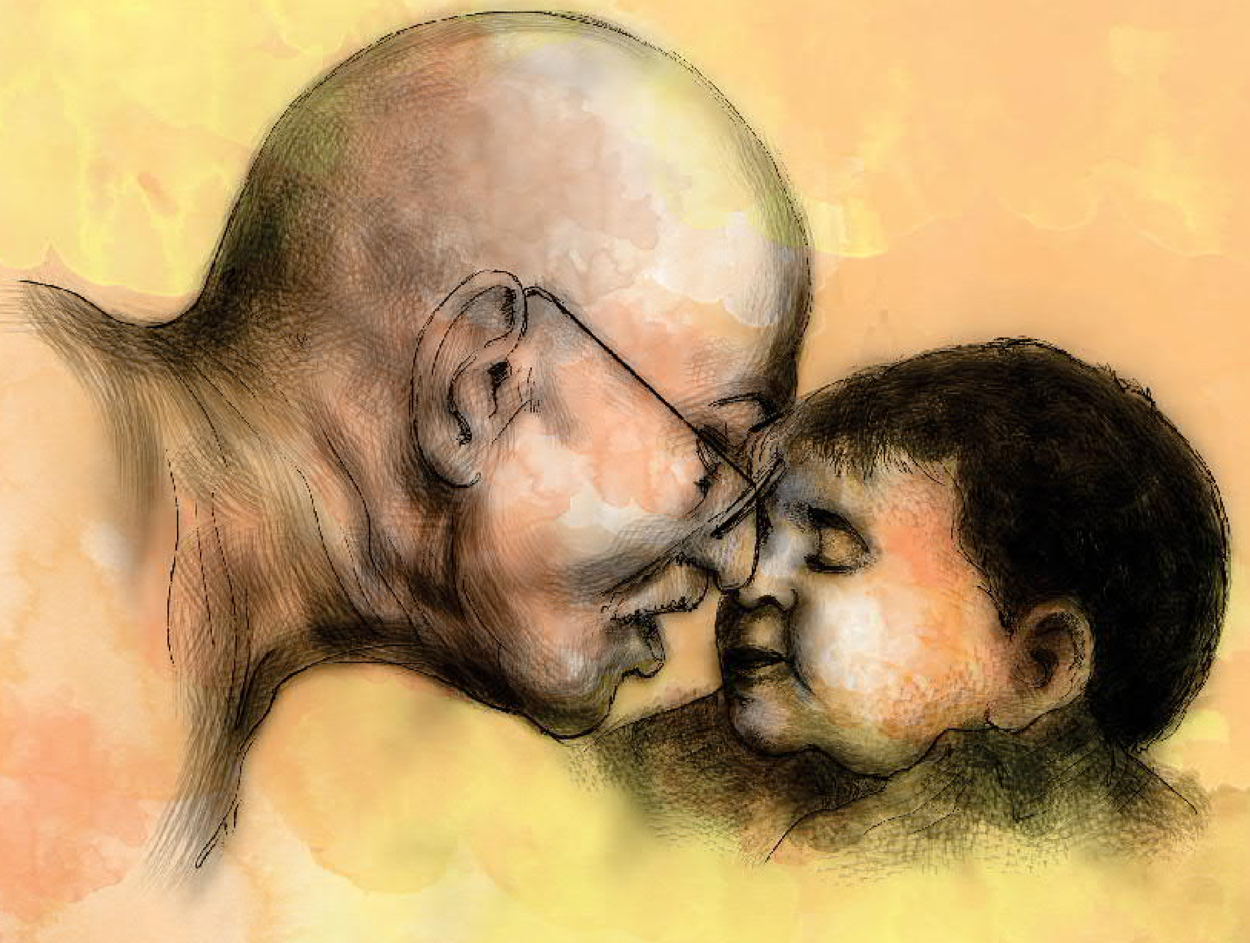

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اردو دنیا

دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے ،اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سیمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیش کش

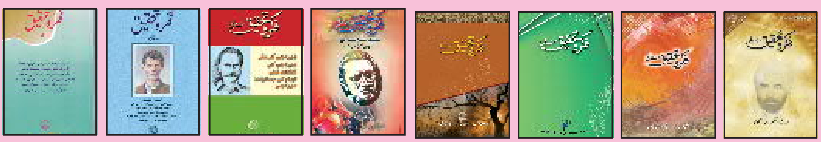

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون: 26109746، فیکس: 26108159
E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

بچوں کی دنیا

جلد:4 شمارہ:10 اکتوبر 2016

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارتِ ترقی انسانی وسائل۔ محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،

جسولہ، نئی دہلی-110025

فون:49539000

شعبہ ادارت: 49539009-11

ای میل

bachonkiduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: 10/ روپے، سالانہ 100/ روپے

■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت

ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم

نئی دہلی-110066

فون:26109746

ای میل:sales@ncpul.in

ncpulsaleunit@gmail.com

علاقائی مرکز: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002

فون:040-24415194

اس شمارے میں

مدیر کا خط	آپس کی باتیں	مدیر	04
بڑوں کی باتیں	ڈاک خانہ		05
گاندھی جینتی	گاندھی جی، بچے اور تعلیم	انصار احمد معروفی	06
	گاندھی جی اور خوش خطی	محمد رفیع انصاری	08
نظمیں	دادی سے باتیں	مظفر حنفی	09
	انٹرنیٹ	عطاء الرحمن	09
مضمون	ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام	شرف الہدیٰ	10
کہانیاں	گھونسلہ	اقبال برکی	13
	دل کی آواز	بشریٰ ارشد	16
نظمیں	صاف صفائی	فاطمہ شاہین	19
	کتاب	ریاض انور بلڈانوی	20
کہانی	دادی اقرا اور مریم مشکورہ	افتخار احمد	21
کھیل اور کھلاڑی	اولمپک کھیل	بانو سرتاج	23
کہانیاں	ہمدرد	محمد محب اللہ	26
	امتحان	مظہر الاسلام	29
	ایئر فون	جمیلہ بی بی	32
نظم	ہر میداں میں آگے بڑھو تم	ساحر داؤد نگری	36
قسط وار ناول	قصہ حاتم طائی	حیدر بخش حیدری	37
نظم	عیسیٰ کی سائیکل	محسن خان	46
کہکشاں	چمن چمن کے پھول	ادارہ	47
	دوست اور دوستی	انصاری ثناء فردوس	49
	اقوال زریں	قاضی عفیفہ ناز ڈاکٹر توصیف	49
	تاریخی معلومات	محمد قیوم میو	50
	حسد کی آگ	مولانا محمد مقصود عالم رضوی	53
	ہنسی کے غبارے		55
ننھے فنکار	کسی کا مذاق نہ اڑاؤ	محراج الدین	56
	کوئل کی کہانی	مسکان ہارون پنجاری	57
آپ کی باتیں	بچوں کی پینٹنگ		60
	اردو فیس بک		62

آپس کی باتیں

دوستو! اکتوبر کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ماہ اکتوبر ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اسی ماہ میں سر سید احمد خاں (17 اکتوبر 1817)، گاندھی جی (2 اکتوبر 1869)، سردار ولبھ بھائی پٹیل (31 اکتوبر 1875)، لال بہادر شاستری (2 اکتوبر 1904) جیسے ملک کے عظیم سپوتوں کی پیدائش ہوئی تھی۔ ان رہنماؤں نے ہمارے ملک کی تعمیر و ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

بابائے قوم موہن داس کرم چند گاندھی نے ملک کو انگریزوں کے قبضے سے آزاد کرانے کے لیے عدم تشدد اور سچائی کا سہارا لیا۔ انھوں نے کبھی بھی ظلم و جبر کے خلاف تشدد کے راستے کو نہیں اپنایا بلکہ صبر، سچائی اور دیانت داری کو اپنا اصول بنایا اور انھی اصولوں پر قائم رہتے ہوئے انگریزوں کے خلاف تحریک چھیڑی۔ پوری دنیا میں گاندھی جی کے فلسفہ عدم تشدد کو احترام کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ مشہور سائنس داں آئنسٹائن نے گاندھی جی کے بارے میں کہا تھا۔

''مہاتما گاندھی کی کامیابیاں دنیا کی سیاسی تاریخ میں منفرد اہمیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے غلام ملک کی آزادی کے لیے اچھوتے طریقے متعارف کرائے جن کے اثرات پوری دنیا میں طویل عرصے تک محسوس کیے جاتے رہیں گے اور ان کی مدد سے ظالم طاقتوں کو شکست دی جاسکے گی۔ گاندھی آنے والی نسلوں کے لیے رہنما شخصیت رہیں گے۔ آنے والی نسلوں کو شاید یقین نہ آئے کہ ایسا انسان کبھی ہمارے درمیان گوشت پوست کی شکل میں تھا۔''

اسی طرح امریکی صدر بارک اوباما جب ہندوستان آئے تو انھوں نے ہندوستانی پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ آج میں اگر امریکی صدر کی حیثیت سے یہاں موجود ہوں تو یہ گاندھی جی کے فلسفے کا اثر ہے۔ اسی طرح مارٹن لوتھر کنگ، نیلسن منڈیلا اور دلائی لاما جیسی عظیم شخصیتیں بھی گاندھی جی کے افکار سے متاثر تھیں اور انھوں نے اپنی زندگی میں گاندھی جی کے فلسفے کو شامل کیا تھا۔

گاندھی جی نے دنیا کے سامنے ایسا نظریہ اور طرز زندگی پیش کیا ہے جسے ساری دنیا میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ موجودہ حالات کے تناظر میں گاندھی جی کے عدم تشدد کے فلسفے کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ پوری دنیا میں آج ظلم و تشدد کا بازار گرم ہے۔ لوگ مذہب، ذات پات، طبقوں اور سرحدی تنازعوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ اس رسہ کشی اور نفسا نفسی میں ہمیں گاندھی جی کے نظریہ حیات کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ گاندھی جی نے ظلم و تشدد، فساد اور فرقہ وارانہ مسائل میں الجھنے کی بجائے محبت و اخوت اور اتحاد و اتفاق کی تعلیم دی ہے۔ انھوں نے ذات، مذہب، نسل اور زبان کی سطح پر ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ ملک کی سالمیت اور استحکام کے لیے قومی ایکتا کو ضروری تصور کرتے تھے۔ وہ پوری دنیا کو ایک کنبہ مانتے تھے اور ان کا مقصد یہ تھا کہ ساری دنیا میں امن و شانتی قائم ہو اور لوگ ایک دوسرے سے بھید بھاؤ نہ کریں بلکہ مل جل کر رہیں۔ گاندھی جی کے فلسفہ عدم تشدد کو عام کرنے کے لیے ان کے یوم پیدائش 2 اکتوبر کو اقوام متحدہ نے عالمی یوم عدم تشدد کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ ایک طرح سے گاندھی جی کے سیاسی اور سماجی نظریات کو عالمی سطح پر خراج تحسین پیش کرنے کی عقیدت مندانہ کوشش ہے۔

'بچوں کی دنیا' کے اس شمارے میں گاندھی جی کے حوالے سے تحریریں شامل ہیں، ساتھ ہی حال ہی میں منعقدہ اولمپک گیمس پر بھی ایک خصوصی مضمون شائع کیا جارہا ہے۔ آپ سب اپنے محبوب رسالے سے لطف اندوز ہوں اور اپنے تاثرات سے ہمیں ضرور آگاہ کریں۔

آپ کا

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

ڈاک خانہ

'بچوں کی دنیا' کا شروع دن سے خریدار ہوں۔ گھر کے سبھی بچوں کو 'بچوں کی دنیا' کا ویسے ہی چسکا لگ گیا ہے جیسے ہمیں اپنے زمانے میں 'کھلونا' یا 'جنت کا پھول' کا چسکا لگا ہوا تھا۔ اِس زمانے میں جب کہ ہماری کتابوں، رسالوں سے لگاتار دوری بڑھتی جارہی ہے 'بچوں کی دنیا' سے یہ لگاؤ آپ کی محنت اور جستجو کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ آپ کی ادارت میں کونسل کے تینوں ہی جرائد خوب سے خوب تر کی جانب رواں دواں ہیں۔

سمیع الدین خاں شاداب، امحلہ گوجرٹولہ، مسجد ظہورالدین، رامپور، یوپی

'بچوں کی دنیا' ہمارے اسکول میں بہت مقبول ہے۔ سبھی بچے 'بچوں کی دنیا' دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔

امجد قاسم صاحب قریشی، ضلع پریشد اردو اسکول پاچل

میں 'بچوں کی دنیا' کا گزشتہ ایک سال سے پوری پابندی کے ساتھ مطالعہ کرتا آرہا ہوں اور اس کا شیدائی و پرستار ہوں۔ مجھے ہر مہینے اس رسالے کا بڑی بےصبری سے انتظار رہتا ہے۔ ماہِ اپریل 2016 کا شمارہ اس وقت میرے ہاتھوں میں ہے۔ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی اس شمارے میں آپس کی باتیں، ڈاکٹر بابا صاحب کی زندگی پر مضامین، نظمیں، کہانیاں، سائنس کی الف لیلہ، کہکشاں، ننھے فنکار، آپ کی باتیں وغیرہ بے حد پسند آئے۔

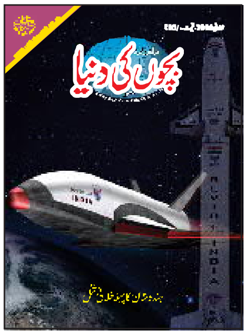

محراج الدین، پوسٹ سلر، پہلگام، کشمیر

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' مجھے بہت پسند ہے۔ یہ رسالہ ہر ماہ ہمارے یہاں پابندی سے آتا ہے۔ آج پوری دنیا میں اس رسالے کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ اردو رسائل کی دنیا میں ویسے تو بہت رسالے نکل رہے ہیں مگر 'بچوں کی دنیا' نے ایک منفرد مقام بنالیا ہے۔ 'بچوں کی دنیا' افق پر ہمیشہ تابندہ رہے یہی میری دعا اور یہی میری تمنا ہے۔

روبینہ ساگر روبی

آپ نے 'بچوں کی دنیا' کے ذریعے طلبا کی ذہنی استعداد کو بڑھانے کی بے مثال کوشش کی ہے۔ آج یہ رسالہ ہر اسکول میں پہنچ رہا ہے اور طلبا اس سے استفادہ کررہے ہیں۔

قاضی نوید اقبال طاہر الدین، نور اردو ہائی اسکول، دھولیہ

'بچوں کی دنیا' ہر ماہ نظر نواز ہوتا ہے۔ ماشاء اللہ بہت خوب صورت رسالہ ہے اور اس کے سبھی کالم بہت پسند آتے ہیں۔

ایمن تنزیل، رامپور، اتر پردیش

انصار احمد معروفی

گاندھی جی، بچے اور تعلیم

گاندھی جی کو بچوں سے بے انتہا محبت تھی۔ وہ بچوں میں تعلیمی شعور بیدار کرنا چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ بچے ایسی تعلیم حاصل کریں جس سے ان میں وسعت، بیداری اور آپس میں محبت پیدا ہو۔ بچوں میں وہ محبت کا ایک ایسا پوشیدہ جہاں دیکھ رہے تھے جس سے بچوں کے دل و دماغ روشن ہو، وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ جہاں ہم بچوں کو رہن سہن، تعلیم اور تہذیب وتمدن سکھاتے ہیں، اسی کے پہلو بہ پہلو ان بچوں سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں جو چیزیں قدرت نے ان بچوں میں محفوظ کردی ہیں اور جن سے ہم اپنی عمر کی رفتار کے ساتھ ترک کرتے چلے جاتے ہیں، گاندھی جی بچوں کی فطری صلاحیتوں کے معترف تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ ’’چھوٹے بچوں سے بھی بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔‘‘

یہ بات مسلّم ہے کہ بچے من کے سچے اور دل کے صاف ہوتے ہیں۔ وہ جھوٹ نہیں بولتے۔ سچائی کو نہیں چھپا سکتے۔ ان کا منھ کسی لالچ اور دھمکی سے بند نہیں کیا جاسکتا۔ وہ دل میں کینہ اور عداوت نہیں رکھتے۔ اگر کسی بات پر لڑتے جھگڑتے بھی ہیں تو تھوڑی دیر میں ’’من‘‘ بھی جاتے ہیں عموماً بچوں میں بناوٹ، تکلف نہیں ہوتا اور وہ اخلاقی برائیوں اور جھوٹ سے پاک ہوتے ہیں۔ گاندھی جی خود اپنے بچپن کے بارے میں لکھتے ہیں ’’مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی بھی کسی استاد یا کسی لڑکے سے جھوٹ بولا ہو۔‘‘

مہاتما گاندھی کے نزدیک ملک کا ہر بچہ صرف اپنے خاندان کی ملکیت اور ان کی امید نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ پورے ملک کا مستقبل اور قوم کا سرمایہ ہوتا ہے۔ بچوں کو ان کے بچپن ہی سے ایسی تعلیم ملنی چاہیے جو جسمانی نشو ونما کے ساتھ ان کے ذہنی ارتقا کی علامت سمجھی جائے۔ اس لیے گاندھی جی ہر گھر کو ایک اسکول اور ہر ماں باپ کو ایک معلم کا درجہ دیتے تھے۔ گاندھی جی معاشرتی تعلیم کے قائل تھے جس سے پورے معاشرے کو نفع ہو۔ وہ ہر گھر کو ایک تعلیم گھر اور والدین کو استاد کا درجہ دینے کے حق میں تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ ’’تعلیم وہ علم اور فن ہے جس کے ذریعے بچے کی نشو ونما اور قوم کی ضروریات کے مابین ایک رابطہ پیدا کیا جاتا ہے اور ملک کے

نوجوانوں کو اس کے جسم کا ایک مناسب عضو بنایا جاتا ہے۔“

گاندھی جی ایسی تعلیم اور نصاب کے قائل تھے جس سے ایسا معاشرہ پیدا ہو جہاں اونچ نیچ اور ذات پات کی تقسیم کی گنجائش نہ ہو۔ وہ چاہتے تھے کہ تعلیم سے بچوں کی جسمانی، دماغی، روحانی اور اخلاقی صلاحیتوں کو فروغ ملے۔ اسی کے ساتھ گاندھی جی کا خیال تھا کہ تعلیم کے ساتھ بچوں کو کسرت، ورزش اور سیر و تفریح کرنا چاہیے۔ کہتے ہیں کہ ”میں نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ کھلی ہوا میں گھومنا صحت کے لیے فائدے مند ہوتا ہے“ یہ بات مجھے اچھی لگی اور تبھی سے میں نے سیر کرنے کی عادت ڈال لی۔ اس سے میرا جسم مضبوط ہوگیا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ”تعلیم کے ساتھ ورزش کرنا بھی لازمی ہے۔“

اونچا سے اونچا اسکول، مہنگی فیس، یونی فارم خرچ و دیگر اضافی کمر توڑ تعلیمی اخراجات، جس کی وجہ سے غریب، مفلوک الحال اور پس ماندہ طبقے والے خواہش کے باوجود اپنے بچوں کو تعلیم کے میدان میں آگے بڑھانے کا تصور بھی نہ کر سکیں۔ ان کے بچے غیر ضروری خرچ کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم سے محروم ہو جائیں۔ ایسی مہنگی تعلیم ملک و قوم کے مفاد کے خلاف ہے۔

گاندھی جی کو اس بات کا احساس تھا کہ ہندوستان کی آبادی کا بڑا حصہ دیہاتوں میں رہتا ہے جو پسماندہ ہونے کے ساتھ غریب اور اَن پڑھ ہے۔ اس لیے وہ ہندوستان کے قصبہ قصبہ، گاؤں گاؤں، دیہات دیہات اسکول کھولنا چاہتے تھے۔ جہاں غریب سے غریب دیہاتی بچے اسکولی تعلیم سے فائدہ اٹھا سکیں اور مالی وسائل کی کمی اور شہر سے دور، دیہات میں رہنے کی وجہ سے تعلیم سے محروم نہ رہ جائیں، ورنہ ہندوستان کی ترقی کا وہ خواب کہ ”سب پڑھیں، سب بڑھیں“ ایک خواب ہی رہ جائے گا، آبادی خود کفیل نہ ہوگی، شعور بیدار نہ ہوگا، تعلیم جب تک عام نہ ہوگی بے روزگاری کے مسائل حل نہ ہوں گے اور نتیجے کے طور پر بچے تعلیم سے محروم ہو جائیں گے۔

گاندھی جی ”تعلیم ملازمت حاصل کرنے کا مقصد“ سے اختلاف رکھتے تھے، ان کے نزدیک تعلیم کا مقصد ملک و قوم کی خدمت کرنا اور باعزت زندگی گزارنا تھا۔ اسی لیے وہ بچوں کو تعلیم کے ساتھ کوئی دست کاری اور ہنر سیکھنے پر نہ صرف زور دیتے تھے بلکہ ”سابرمتی آشرم“ میں بچوں کو تکلی کاتنے، جوتے گانٹھنے اور روزانہ کے ضروری کام کو اپنے ہاتھ سے انجام دینے کی ترغیب دیتے تھے۔

■

Ansar Ahmad Marufi
Baluwa, Kurthi, Jafarpur
Mau - (UP)

محمد رفیع انصاری

گاندھی جی اور خوش خطی

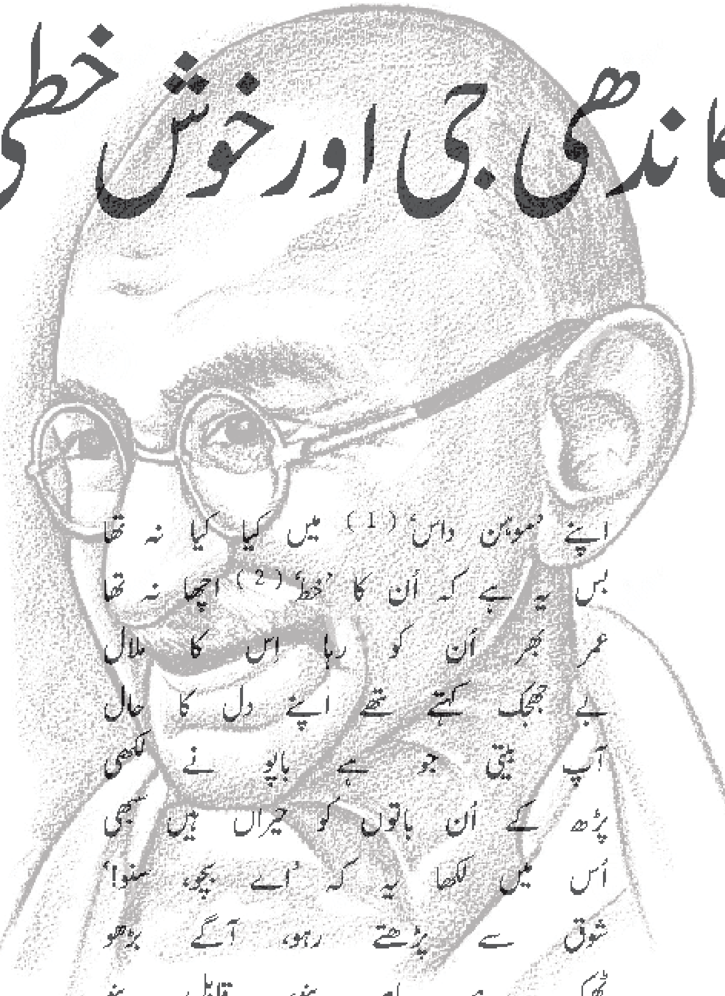

اپنے 'موہن داس'(1) میں کیا کیا نہ تھا
بس یہ ہے کہ اُن کا 'خط'(2) اچھا نہ تھا
عمر بھر اُن کو رہا اس کا ملال
بے جھجک کہتے تھے اپنے دل کا حال
آپ بیتی جو ہے باپو نے لکھی
پڑھ کے اُن باتوں کو حیراں ہیں سبھی
اُس میں لکھا یہ کہ 'اے بچو، سنو!
شوق سے پڑھتے رہو، آگے بڑھو
ٹھیک ہے ماہر بنو، قابل بنو
خوش خطی کی مشق بھی کرتے رہو
خوش خطی ہے کامیابی کی دلیل
خوش خطی ہے، خوش نصیبی کی دلیل'

(1) موہن داس: گاندھی جی کا اصل نام
(2) خط: لکھائی

Mohd Rafi Ansari
Al-Madni Complex, 734 Bhosar Mohalla
Bhiwandi - 421308
Distt. Thane (Maharashtra)

مظفر حنفی

دادی سے باتیں

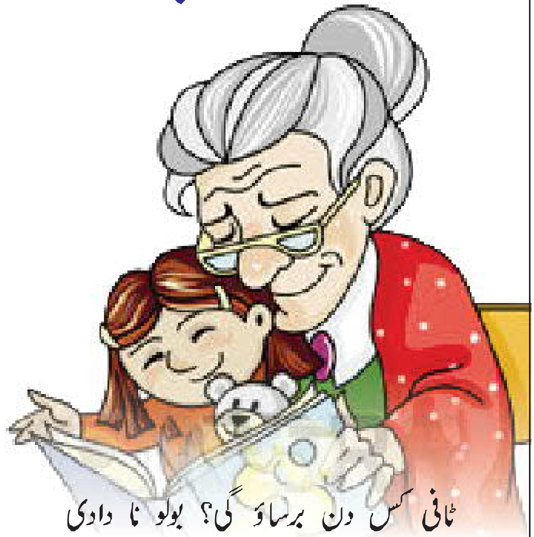

ٹافی کس دن برساؤ گی؟ بولو نا دادی
چاند ستارے کب لاؤ گی؟ بولو نا دادی
کب تک ہم کو ٹرخاؤ گی؟ بولو نا دادی

کتا گملہ توڑ گیا ہے یہ دیکھو دادی
چوہا پیالی پھوڑ گیا ہے یہ دیکھو دادی
کوّا ڈالی موڑ گیا ہے یہ دیکھو دادی

مکڑی جالے کیوں بنتی ہے؟ دادی بوجھو تو
بندریا سر کیوں دُھنتی ہے؟ دادی بوجھو تو
بیر بہوٹی کیا چنتی ہے؟ دادی بوجھو تو

Prof. Muzaffar Hanfi
D-40, Batla House, Jamia Nagar
New Delhi - 110025

عطاء الرحمن

انٹرنیٹ

کُو بہ کُو جا بہ جا ہے انٹرنیٹ
جہاں دیکھو لگا ہے انٹرنیٹ
گھر ہو، اسکول ہو یا دفتر ہو،
لازمی ہوگیا ہے — انٹرنیٹ
گفتگو ہورہی ہے کیفے میں
سائبر سلسلہ ہے انٹرنیٹ
کیا نہیں اس کی ویب سائٹ میں
جامِ جمشید سا ہے انٹرنیٹ
سوچ میں اِندر دیو بیٹھے ہیں
جال سا بن رہا ہے انٹرنیٹ
مجھ کو ای میل بھیجتے رہنا
یعنی میرا پتا ہے انٹرنیٹ

Ataur Rahman Tariq
701/3A, Vijaya Co-op. Hsg. Society
Vaishali Nagar, K.K.Road
Mahalaxmi, Mumbai - 400011

شرف الہدیٰ

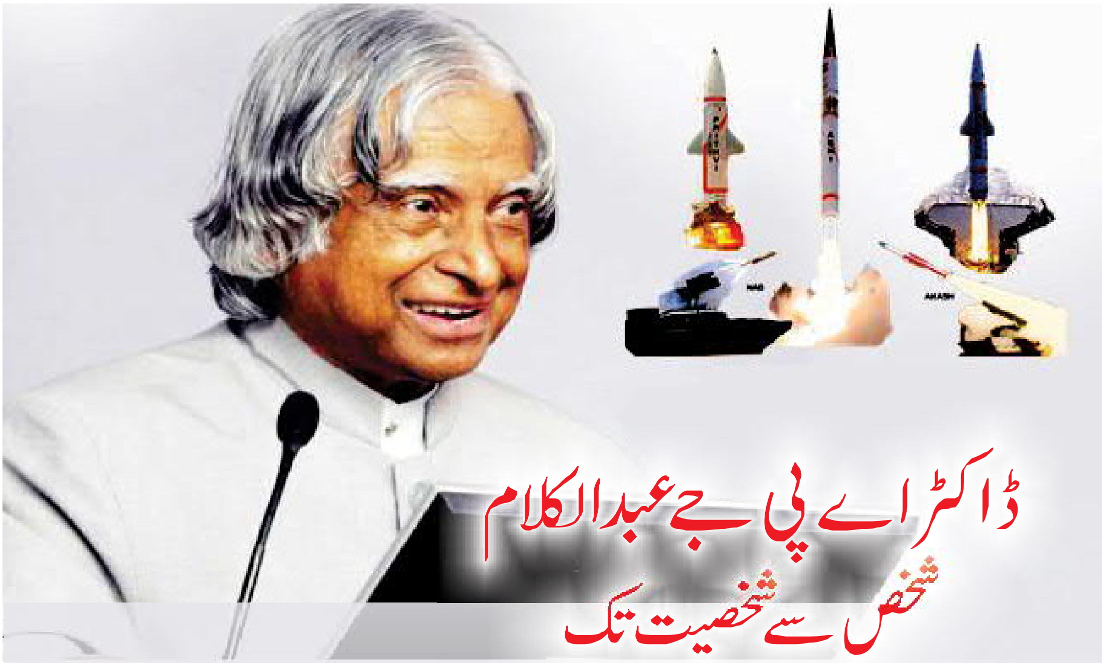

ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام
شخص سے شخصیت تک

ایسی کئی نامور ہستیاں گزریں جنھوں نے اپنی ذات کو بڑی جانفشانی، جدوجہد اور قربانیوں کے بعد ایک اعلیٰ منزل پر پہنچایا۔ جو ملک وقوم اور نوجوانوں کے لیے نظیر بنیں۔ ایسا ہی ایک نام ابوالفاخر زین العابدین عبدالکلام کا ہے۔ جن کی زندگی آج لوگوں کے لیے قابل تقلید بنی۔ مگر کیسے؟ اس سوال کے جواب میں ہمیں اے پی جے عبدالکلام کی پچھلی زندگی کا مطالعہ ضروری ہے جو آج ہم سب لوگوں کے لیے حوصلہ کا باعث ہے۔

عظیم سائنس داں ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کی پیدائش صوبہ تامل ناڈو کے رامیشورم ضلع کے ایک گاؤں دھنش کوڈی میں 15 اکتوبر 1931 کو ہوئی۔ آپ کے والد کا نام زین العابدین تھا۔ والد محترم مولانا ابوالکلام کی شخصیت سے کافی متاثر تھے۔ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کے والد صاحب کشتیاں چلایا کرتے تھے۔ مشہور سائنس داں عبدالکلام شروع سے محنتی، جفاکش، ایماندار، ذہین اور عقلمند تھے۔ وہ صبح سویرے چار بجے اٹھتے، غسل کرتے اور پڑھنے کے لیے استاد کے پاس چلے جاتے۔ والد نماز کے لیے لے جاتے اور عربی اسکول میں قرآن پڑھاتے۔ وہ پابندیٔ وقت کا بڑا خیال رکھتے اور اصول وضابطے کے پابند ہوتے۔ انھوں نے زندگی کے نشیب وفراز کو قریب سے دیکھا اور برداشت کیا۔ صبح سویرے رامیشورم کے اسٹیشن جاتے جو تین کلومیٹر دوری پر تھا۔ وہاں سے اخبار اٹھاتے اور پھر فروخت کرتے۔ اخبار بانٹ کر آتے تو گھر پر ناشتہ کرتے۔ پھر اخبار کی قیمت وصول کرنے شہر میں جاتے۔ یہ تھی ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کی زندگی کی تصویر۔

سائنس میں گریجویشن کی تعلیم تروچی کے سینٹ جوزف کالج سے حاصل کی۔ 1954 سے 1957 میں مدراس کے انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی (ایم آئی ٹی) سے ایروناٹیکل انجینئرنگ میں ڈپلومہ کیا۔ 1958 میں ڈی ٹی ڈی اینڈ پی میں بطور سینئر

Scientist مقرر ہوئے اور اسی سال Defence Research سنٹر ڈی آر ڈی او میں سینئر معاون سائنس داں کی حیثیت سے مقرر ہوئے۔ واضح ہو کہ ان کی نگرانی میں سائنس دانوں کی ٹیم نے Proto type Hover Craft کو بلندی پر پہنچایا۔ ڈاکٹر کلام نے ڈی آر ڈی او کو خیر باد کہہ دیا اور ہندوستانی خلا مشن سے منسلک ہو گئے۔ 1980 میں کامیابی کے ساتھ انھوں نے روہنی سٹیلائٹ کو Space میں بھیجا۔ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ وہ اونچی اڑان بھرنے کے لیے اس جہان میں بھیجے گئے تھے۔ ان کی شخصیت کثیر الجہت (Multi faceted personality) تھی۔ جس پر آج قوم و ملک اور نوجوانوں کو ناز ہے۔ انھوں نے ملک وقوم کو بہت کچھ دیا، لیا نہیں۔ خاکساری، انکساری، رحمدلی، بردباری یہی ان کا شیوہ تھی جس سے ان کی عظمت نکھر کر سامنے آئی اور دنیا کو ان کی بے پناہ صلاحیتوں کا لوہا ماننا پڑا۔

ڈاکٹر عبدالکلام صاحب کو اپنی کارکردگی کے لیے 1981 میں پدم بھوشن ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ 25 نومبر 1997 کو ملک کا سب سے بڑا اعزاز بھارت رتن سے انھیں نوازا گیا۔ 1998 میں قومی یکجہتی کے فروغ کے لیے آپ کو اندرگاندھی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ہندوستانی ڈیفنس کے شعبہ میں انھوں نے ملک کو کافی بلندیوں تک پہنچایا اور ایک وقار بخشا۔ آپ حکومتِ ہند کے سائنسی مشیر بھی رہے۔ ایٹمی اور میزائل تجربے کی کامیاب حصولیابیوں میں آپ کے کارنامے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ ان میں ناگ، آکاش، پرتھوی، ترشول اور اگنی جیسے میزائیلوں کا کامیاب تجربہ کیا گیا۔

25 جولائی 2002 کو ان کی زندگی کے دوسرے پہلو کا بھی اہم دن رہا۔ جب ڈاکٹر کلام صدر جمہوریہ ہند کے اعلیٰ وارفع عہدے پر فائز ہوئے۔ اُس وقت ہندوستان میں

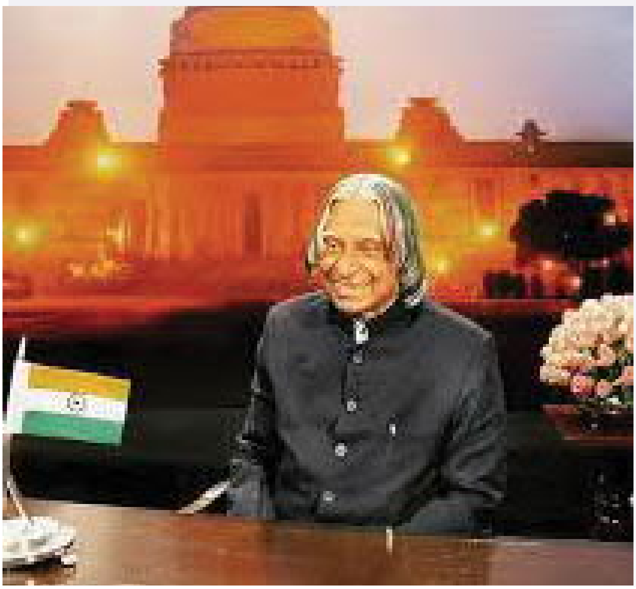

اٹل بہاری واجپئی جی کی حکومت تھی۔ ڈاکٹر کلام صاحب نے سائنسی خدمات کو فروغ دینے کی خاطر بہت قربانیاں دی ہیں۔ پوری زندگی سائنس اور عوام کی خدمت کے نام وقف کردی۔ بچوں سے بھی بے پناہ محبت اور شفقت تھی۔ آپ نے ویسے تو دس، گیارہ کتابیں تحریر کیں، جن میں Wings of fire اور India 2020 کافی اہم ہیں اور یہ خاص کر طالب علموں کو حوصلہ بخشنے والی کتابیں ہیں۔ یہ کتابیں طالب علم کے لیے پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

پروفیسر عبدالکلام صاحب کو 30 یونیورسٹیوں نے اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی تھی۔ ڈاکٹر کلام کی زندگی بڑی سادہ تھی۔ اُن کے گراں قدر مشورے میں تھا کہ اگر ملک کو ترقی کرنا ہے تو سائنس اور ٹکنالوجی کو بڑھاوا دینا نہایت ضروری ہے۔ سائنس کی دنیا میں اس عظیم انسان کا نام نہایت احترام کے ساتھ لیا جائے گا۔ ان کا یقین مذہب کے بہترین فلسفہ میں تھا۔ ان کا پیغام صوفیوں کا پیغام تھا۔

میزائیل مین ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کا 27 جولائی 2015 کو انتقال ہوگیا۔ ان کا انتقال ہوا تو بچوں نے آنسو بہائے، بڑوں نے ان کی شان میں قصیدے لکھے اور پورا ملک بے حد سوگوار رہا۔

ڈاکٹر عبدالکلام کے چند قیمتی اقوال جو طلبا اور ملک کے نوجوان کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے اور مستقبل کے سائنس دانوں کے لیے مشعل راہ ہوں گے:

- ''سپنے وہ نہیں جو ہم سوتے ہوئے دیکھتے ہیں، سپنے وہ ہیں جو ہمیں سونے نہیں دیتے۔''
- ''مصنوعی آرام کے بجائے ٹھوس کارناموں کے لیے خود کو وقف کیجیے۔''
- ''عظیم خواب دیکھنے والوں کے عظیم خواب ہمیشہ پورے ہوتے ہیں۔''
- ''اللہ نے ہمارے دماغ اور جسم میں بے پناہ قوت اور صلاحیت دی ہے، اللہ کی عبادت ہمیں ان قوتوں کو فروغ دینے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔''
- ''بلندی تک پہنچنے کے لیے طاقت چاہیے ہوتی ہے، چاہے وہ ماؤنٹ ایوریسٹ کی چوٹی ہو یا خود کا پیشہ۔''
- ''آیئے ہم اپنے آج کو قربان کردیں تاکہ ہمارے بچوں کا مستقبل بہتر ہوسکے۔''

■

Sharful Hoda
C/o Retd. Prof. Omair Khan
P.O: Mahendru, Mewasao Lane
Sultan Ganj, Patna - 800006 (Bihar)

اقبال برکی

گھونسلہ

شہر کا ایک علاقہ تھا۔ بستی کے کچے پکے مکانات چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں کہیں کوئی زیادہ اونچی عمارت تھی تو کچھ مکانات ابھی تک پرانے، چھوٹے اور خستہ تھے۔ بستی میں کہیں کہیں بڑی بڑی خالی جگہیں تھیں تو کہیں چھوٹی جگہیں تھیں جن میں بستی کے بچے کھیلتے ہوئے نظر آتے تھے۔ ان خالی جگہوں کے علاوہ مکانات کے درمیان بھی بہت سے اونچے نیچے چھوٹے بڑے گھنے اور کم پھیلاؤ والے ہرے بھرے درخت تھے جن کے درمیان مختلف قسم کے پرندے اُڑتے بیٹھتے آجاتے تھے۔

اسی بستی کی ایک پختہ اور بلند عمارت کی چھت پر چڑیوں کا ایک جوڑا بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں چڑیاں اداس تھیں اور بڑی حسرت سے ایک جانب دیکھے جارہی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد وہاں دو چڑیاں اور آبیٹھیں۔ آنے والی دونوں چڑیاں پہلے سے بیٹھی ہوئی چڑیوں کے بالکل قریب آکر بیٹھی تھیں۔ چڑیوں نے آنے والوں کو ایک نظر دیکھا مگر ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہ پہلے کی طرح بیٹھی اداس نظروں سے اسی سمت دیکھے جارہی تھیں جدھر وہ پہلے سے دیکھ رہی تھیں۔ آنے والی دونوں چڑیاں بھی انھیں اداس دیکھ کر اداس ہوگئیں۔ کچھ دیر بعد آنے والی میں سے ایک پھدک کر کچھ دور جا بیٹھی۔ اس کے پھدک کر دور جاتے ہی اس کے ساتھ آنے والی دوسری چڑیا بھی پھدک کر اس کے قریب چلی گئی۔ دونوں جب ایک دوسرے کے بہت قریب ہوگئیں تو پھر دونوں ایک بار پھدک کر عمارت کے دوسرے کونے پر جا پہنچیں۔ جیسے ہی وہ دونوں عمارت کے کونے پر پہنچیں وہاں دو چڑیاں اور آئیں اور ان دونوں جوڑوں کے درمیان میں بیٹھ گئیں۔ آنے والی چڑیاں بیٹھتے ہی چوں چوں کر کے چہچہانے لگیں اور کچھ دیر چہچہا کر خاموش

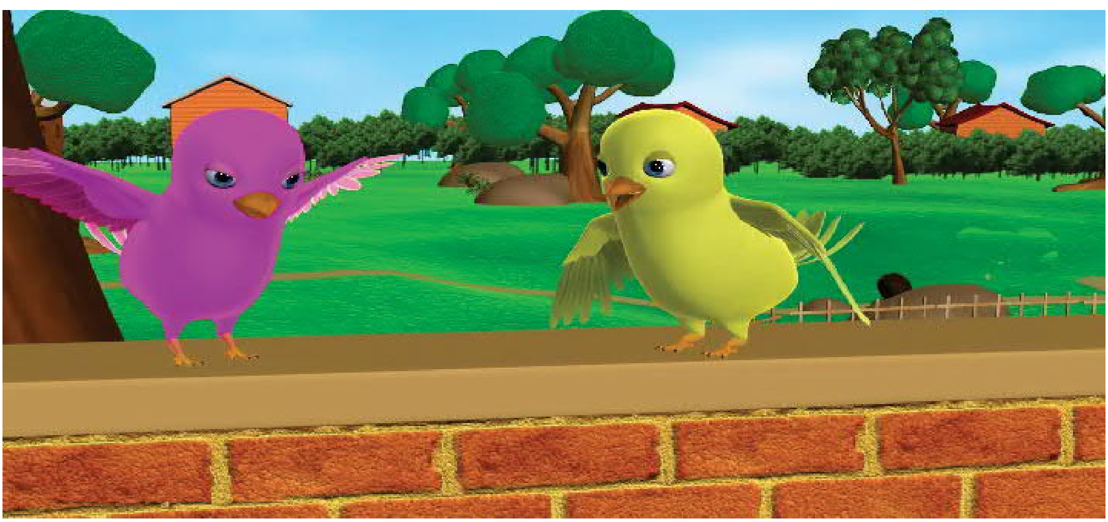

ہوگئیں۔ ابھی یہ خاموش ہی ہوئی تھیں کہ وہاں ایک ساتھ کئی چڑیاں آبیٹھیں اور چوں چوں کرکے چہچہانے لگیں۔ کچھ دیر بعد وہاں سناٹا چھا گیا۔ وہاں موجود سب چڑیاں ایک ساتھ خاموش ہوگئیں۔ چڑیوں کا وہ جوڑا جو پہلے سے عمارت کی چھت پر بیٹھا ہوا تھا اب بھی اداس تھا اور دونوں اب بھی وہ اُدھر ہی دیکھ رہے تھے جدھر پہلے دیکھ رہے تھے۔ آنے والی چڑیاں آئیں، چھت پر بیٹھتیں، انھیں دیکھتیں اور چہچہا کر خاموش ہوجاتی تھیں۔ آنے والی چڑیوں میں سے کچھ دیر بعد کچھ وہاں سے اڑ گئیں اور کچھ دوسری اور وہاں آکر بیٹھ گئیں۔ اس طرح آنے جانے والی چڑیوں کا سلسلہ جاری رہا۔

بہت دیر بعد آنے والی چڑیوں میں سے اک چڑیا پھدکتی ہوئی اسی اداس اور غمگین جوڑے کے قریب پہنچی۔ کچھ دیر انھیں دیکھتی رہی پھر پلٹ کر اپنی چونچ کو اپنی پیٹھ کے پروں میں ڈال کر کچھ تلاش کرتی رہی۔ اس کے بعد جب سیدھی ہوئی تو اس کی چونچ میں ایک بہت چھوٹا سا پر روئی کے چند ریشوں کی طرح دبا ہوا تھا۔ وہ پر کو چونچ میں دبائے اداس چڑیوں کو دیکھتی رہی پھر پر کو ہوا میں چھوڑ دیا۔ اسی وقت نیچے گلی میں ایک زوردار دھما کہ ہوا شاید کسی موٹر سائیکل کا ٹائر پھٹا تھا۔ چھت پر بیٹھی ہوئی چڑیاں ایک دم سے سہم گئیں ایک آدھ تو اسی وقت وہاں سے اُڑ کر کسی اور طرف چلی گئی۔

دھماکے کے کچھ دیر بعد عمارت کی چھت پر جیسے حالات پھر معمول پر آگئے۔ وہاں آنے جانے والی چڑیوں کا تانتا بندھا رہا۔ عمارت کے ایک کونے پر چڑیوں کا جوڑا جو سب سے پہلے آیا تھا وہ اُڑ کر گیا اور ایک لمبا کا واکاٹ کر پھر وہیں آبیٹھا۔ اداس جوڑا اب بھی اداس تھا۔ وہ چڑیا جوان کے قریب آئی تھی وہ انھیں غور سے دیکھتی رہی۔ اس نے بھی کئی بار نظریں گھما کر ادھر دیکھا تھا جدھر وہ دونوں حسرت سے دیکھ رہی تھیں۔

آخر بہت دیر بعد وہ چڑیا جوان کے قریب آئی تھی اس نے ان کو مخاطب کیا۔ وہ بولی، ''تم دونوں اداس کیوں ہو، کیا ہوا ہے؟''

دونوں نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ مادہ تو آنے والی کو دیکھتی رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی حسرت کے گہرے بادل تھے لیکن نر نے ایک بار ایک نظر اسے دیکھا اور گردن جھکا کر پھر ادھر دیکھنے لگا جدھر وہ پہلے بھی دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنے دونوں پروں کو تھوڑا سا کھولا اور ایک مرتبہ انھیں زور سے تھرکا کر جھٹکا پھر اپنا ایک پاؤں اٹھا کر اپنے کان کے پاس کھجانے لگا۔ اس کی نظریں اب بھی پہلے کی طرح ادھر ہی لگی ہوئی تھیں۔

آنے والی چڑیا نے ایک بار پھر پوچھا، ''کیا ہوا ہے تم دونوں کو، اتنی اداس کیوں ہو؟''

مادہ جو اسے مسلسل دیکھے جارہی تھی اب بھی کچھ نہیں بولی، صرف اپنی گردن ہلا کر رہ گئی تھی۔

''کیا شریر بچوں نے تمھارے گھونسلوں سے انڈوں کو نکال کر پھینک دیا ہے؟''

''نہیں!'' مادہ نے مختصر سا جواب دیا اور خاموش ہوگئی۔

چڑیا نے پھر پوچھا، ''تو پھر کیا ہوا ہے، دونوں اتنی اداس کیوں ہو؟''

مادہ نے چڑیوں کے اس جوڑے کی طرف اشارہ کیا جو سب سے پہلے وہاں آیا تھا اور ان کے قریب سے پھدک کر دور عمارت کے دوسرے کونے پر جا بیٹھا تھا۔ وہ دونوں اب بھی تھوڑی تھوڑی دیر بعد اُڑ کر جاتے اور ایک لمبا کاوا کاٹ کر غمگین چڑیوں سے دور عمارت کے کونے پر آبیٹھتے تھے۔ وہ

ابھی ابھی پھر ایک کاوا کاٹ کر آ کر بیٹھے تھے۔ مادہ بولی، ''انھیں دیکھو۔ وہ ہمارے ہی بچے ہیں۔''

''چڑیا بولی، ''ہاں وہ تو میں دیکھ رہی ہوں۔ دونوں جوان ہیں اور بار بار اپنے بازوؤں کو آزمارہے ہیں۔''

''ہاں، ابھی پچھلے ہفتے ہی دونوں نے پہلی اڑان بھری تھی۔'' مادہ بولی۔

''بہت اچھا! اب تو وہ اڑنے لگے ہیں۔ تمھیں تو خوش ہونا چاہیے، پھر؟'' چڑیا اب بھی مادہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ نر اب بھی اداس اور ان دونوں کی باتوں سے بے نیازی ادھر ہی دیکھ رہا تھا جدھر وہ پہلے سے دیکھ رہا تھا۔

مادہ بولی، ''وہ نیچے گلی میں دیکھو، وہاں جہاں سے دھول اڑ رہی ہے۔ وہ عمارت ٹوٹ رہی ہے۔ وہیں اسی عمارت میں ہمارا گھونسلہ تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ ان کا گھونسلہ بھی اسی عمارت میں ہمارے قریب ہی بن جاتا۔ لیکن تم دیکھ رہی ہو، عمارت کیسی تیزی سے توڑی جارہی ہے۔ ہمارا گھونسلہ برباد ہو چکا ہے۔''

چڑیا نے جھک کر نیچے دیکھا۔ گلی میں ایک جگہ سے بہت دھول اڑ رہی تھی۔ وہاں کچھ لوگ تیزی سے ایک عمارت کو توڑنے میں مصروف تھے۔ کچھ مشینیں بھی تھیں جن کا شور گلی میں گونج رہا تھا۔ چڑیا کچھ دیر وہ سب کچھ دیکھتی سنتی رہی پھر گردن اٹھا کر اس نے دونوں کو باری باری دیکھا، ایک ٹھنڈی سانس چھوڑ کر بولنے لگی، ''پگلی تو اس میں اداس ہونے والی اور دل چھوٹا کرنے کی کون سی بات ہے؟''

مادہ کچھ نہیں بولی۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتی رہی۔ چڑیا کی بات سن کر نر بھی اسے دیکھنے لگا تھا۔

چڑیا دوبارہ بولی، ''وہ مکان ٹوٹ رہا ہے۔ اس میں تمھارا گھونسلہ بھی ٹوٹ گیا۔ غم نہ کرو۔ یہ آدمی ہے ایک مکان توڑتا ہے تو دوسرا لمبا چوڑا اور خوب اونچا بناتا ہے۔ ایک پرانے مکان میں ہمارا ایک گھونسلہ ٹوٹتا ہے تو نئی اور اونچی عمارت میں کئی گھونسلوں کی جگہیں نکل آتی ہیں۔ جاؤ کھاؤ پیو! کچھ دن کی بات ہے پھر تو اس عمارت میں کئی گھونسلے نکل آئیں گے۔''

چڑیا کی بات دونوں کے دل کو لگی تھی۔ مادہ تو کچھ نہ بولی مگر نر نے آنکھیں مٹکا کر چڑیا کو دیکھا اور بولا، ''مگر.....''

چڑیا بولی، ''اگر مگر کچھ نہیں..... کچھ دنوں کی تو بات ہے۔''

نر بولا، ''مگر یہ ہمارا گھونسلہ کیوں توڑ رہے ہیں؟''

چڑیا بولی، ''چھوٹا اور کچا مکان توڑ کر اونچا اور پکا مکان بنانا انسانوں کی ضرورت ہے۔ ان میں گھونسلہ بنانا ہماری ضرورت ہے بس!''

''مگر اس طرح ہم تو اجڑ جاتے ہیں نا؟'' نر نے پھر جرح کی۔

چڑیا بولی، ''ہاں صرف کچھ دن برداشت کرلو۔ وہ بھی کیا کریں اور پھر ہم بھی تو مجبور ہیں۔ آخر ہمیں بھی تو ان کے ساتھ ہی رہنا ہے۔ اچھا چلو۔ بس جاؤ۔ کھاؤ پیو اور دوسرا ٹھکانا تلاش کرو۔ یہیں کہیں مل جائے گا۔ اچھا میں تو چلی۔'' کہہ کر چڑیا اڑ گئی۔

نر اور مادہ نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ کچھ دیر دیکھتے رہے۔ پھر مادہ بولی، ''آخر ہمیں رہنا تو ان کے ساتھ ہی ہے۔'' کہہ کر وہ ایک ہلکی سی چوں کے ساتھ اڑ گئی اور اسی کے ساتھ چوں کرتا ہوا نر بھی اڑ گیا۔ ان کے اڑتے ہی ان کے جوان بچوں کا جوڑا بھی اڑا اور ادھر ہی چلا گیا جدھر دونوں چڑیاں گئی تھیں۔

■

Dr. Iqbal Barki
155, Mahada, Noor Bagh,
Malegaon - 423203, Distt.: Nasik (MS)

بشریٰ ارشد

دل کی آواز

دھک دھک دھک....ارے باپ رے.....یہ پھر سے.....پھر سے وہی آواز.....بسمہ دوڑتے دوڑتے اچانک رک گئی۔ جیسے بہت دھیان سے کچھ سننے کی کوشش کر رہی ہو۔اسکے چہرے سے خوف ظاہر ہورہا تھا۔

چلو اب تمھاری باری۔۔قبرص نے اس کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا

لیکن اس نئی مصیبت پر اسکا من کھیل سے اچاٹ ہوگیا تھا۔

قبرص کو بتاؤں.....نہیں۔

مما کہتی ہیں کوئی بھی بات سب سے پہلے مما کو بتانی چاہیے۔مما کو ہی پہلے بتاؤں گی۔بسمہ نے دل ہی میں سوچا۔

پچھلے کچھ دنوں سے بسمہ کے ساتھ ایک بہت ہی عجیب چیز ہورہی تھی۔ ہوتا یہ کہ جب بھی وہ کھیل میں دوڑتی بھاگتی تو اسکے دل سے عجیب سی آواز آتی۔ دھڑ دھڑ دھڑ دھڑ دھڑ..... جیسے اسکا دل بج رہا ہواور جب زیادہ تیزی سے اور زیادہ دور تک بھاگتی تو یہ آواز اور زیادہ زور سے آتی۔اتنی زور سے کہ وہ ڈر ہی جاتی۔ جب سے اس نے یہ محسوس کیا تھا ایک عجیب سا ڈر اسکے دل میں گھر کر گیا تھا۔ وہ سوچتی آخر اسکے دل میں کون گھس گیا ہے۔ جو اتنی زور سے اٹھا پٹک کرتا ہے۔کہیں کوئی بھوت ووت تو نہیں۔نہیں نہیں مما کہتی ہیں کوئی بھوت ووت نہیں ہوتا۔ یہ تو بس بچوں کو ڈرانے کے لیے لوگ کہتے ہیں۔ ورنہ اس کی کوئی سچائی نہیں۔ پھر کیا ہوسکتا ہے بھلا۔کہیں کوئی جانور تو نہیں۔ اتنا زور زور سے بجاتا ہے ضرور کوئی بڑا جانور ہوگا۔ لیکن اتنا بڑا جانور میرے دل میں گھسا تو کیسے۔ ہائے اللہ کہیں اندر ہی اندر کاٹتا نہ ہو۔ اگر ایسا ہوا تو میرا سارا گوشت ہی کھا جائے گا۔ پھر میں کیسی لگوں گی۔ چڑیل جیسی۔ پھر وہ اندر سے باہر نکل جائے گا۔ پھر اور لوگوں کو بھی کاٹے گا۔ پھر کیا ہوگا۔ سب لوگ ادھر ادھر چھپ جائیں گے۔اپنے اپنے گھر میں بند ہو جائیں گے.....

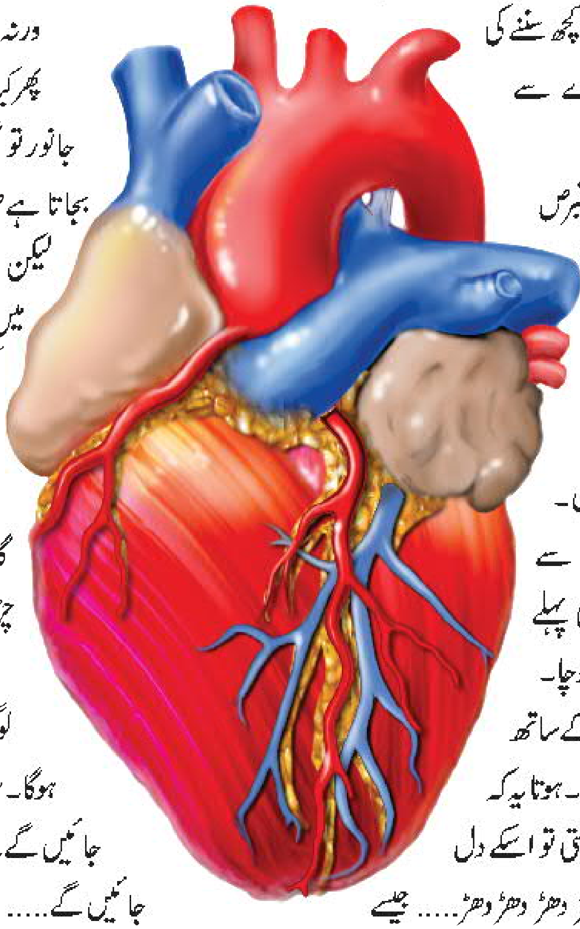

بسمہ بسمہ.....حمدان نے زور سے اس کا کندھا ہلایا۔

چلو چلو۔کھیل ختم کرو۔ گھر چلو۔ ابو بلا رہے ہیں۔مغرب کی اذان ہوگئی۔

گھر آ کر وہ ادھر ادھر کی باتوں میں بھول ہی گئی کہ مما کو اس بارے میں بتانا تھا۔سب بچے اپنی اپنی پڑھائی میں لگ

گئے۔عشاء کا وقت ہوا،ڈائننگ ٹیبل پہ کھانا لگایا گیا۔سب نے کھانا کھایا۔کھانا کھا چکنے کے بعد بسمہ بستر پہ آکر پیٹ کے بل لیٹ گئی۔ جیسے ہی لیٹی۔دھک دھک دھک دھک..... پھر سے وہی آواز.....

ممامما.....نانا ابونانا ابو.....وہ چلاتے ہوئے دوڑ کر بھاگی۔

ابھی سب ڈائننگ ٹیبل پہ ہی تھے۔

کیا ہوا کیا ہوا.....؟۔اسکی چیخ سن کر سب کھانا چھوڑ کر پریشان سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

مماممّا وہ نا۔۔وہ نا۔

کیا ہوا بیٹا آگے بتاؤ۔ نانا ابو نے اسے اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔

نانا ابو.....وہ میرا نا..... آنکھوں میں آنسو بھر کر اس نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔میرا نا دل بج رہا ہے.....

کیا.....؟

ہاہاہاہاہاہاہاہاہاہا.....اس کی اس معصوم بات کو سن کر ڈائننگ ٹیبل پر موجود سبھی افراد کے حلق سے ایک فلک شگاف قہقہہ پھوٹ پڑا.....

اوں اوں ووں ووں ووں اوں ووں۔سب کو اپنے اوپر ہنستا دیکھ بسمہ باقاعدہ آنسوؤں سے رونے لگی۔

سب چپ رہو.....بالکل خاموش..... کوئی نہیں ہنسے گا۔ نانا ابو نے سب کو ڈانٹا۔ حالانکہ خود وہ بھی اپنی ہنسی بڑی مشکل سے کنٹرول کئے ہوئے تھے۔

ہاں بیٹا.....! کیا ہوا میری بیٹی کو۔بتاؤ۔

نانا ابو میں جب بھی کھیلتی ہوں نا یا دوڑتی ہوں تو میرا دل بہت زور زور سے بجنے لگتا ہے۔ نانا ابو میرے دل میں کوئی گھس گیا ہے۔کوئی جانور۔ وہ میرے دل کا سبھی گوشت کھا جائے گا۔ ابھی میں لیٹی ہوئی تھی تو بھی بج رہا تھا۔ بہت زور زور سے۔ میں نے اچھے سے سنا۔ میرے کان میں صاف سنائی دے رہا تھا۔۔ نانا ابو میں کہہ رہی ہوں نا۔ میرے دل میں کوئی جانور گھس گیا ہے۔ وہی اتنی زور زور سے بجاتا ہے اندر میں۔ وہ سانس لیے بغیر بولتی چلی گئی۔

ہاہاہاہاہاہاہاہاہاہاہا.....اس کی دردناک کہانی سن کر ایک بار پھر سب کے قہقہوں سے ڈائننگ ہال گونج اٹھا۔

بسمہ کو بڑا غصہ آیا۔ بتاؤ بھلا اتنی بڑی بات ہوگئی۔کوئی جانور گھس گیا ہے میرے دل کے اندر اور ان لوگون کو ہنسی سوجھ رہی ہے اور تو اور نانا ابو بھی ہنس رہے ہیں۔شدید غصہ کے عالم میں وہ اپنے کمرے میں جا کر سوگئی۔ اس نے سوچا کہ وہ کسی سے بات نہیں کرے گی۔کھانا کھا لینے کے بعد جب سب اپنے اپنے بستروں پر آئے۔تب بھی سب اسی کی بات کا مذاق بنا بنا کر ہنسے جا رہے تھے اور وہ غصہ سے آنکھوں کو میچے جھوٹ موٹ کا سوتی بنی ہوئی تھی۔

سوگئی کیا میری رانی بیٹی..... مما نے اس کے بغل میں لیٹتے ہوئے اسکی پیشانی سہلا کر کہا۔

آج تو رانی بیٹی کے محل میں بڑا جانور گھس آیا ہے۔کہیں ڈائنا سور نا ہو۔طوبیٰ نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔اسکی بات پہ سب پھر سے ہنس پڑے۔

اچھا سب چپ۔کوئی اب کچھ نہیں بولے گا میری بیٹی کو۔سب جا کر سوؤ چپ چاپ سے۔

میرا بیٹا.....! مما نے اسے پچکارتے ہوئے اس کا چہرہ اپنی طرف کرنے کی کوشش کی۔

مجھے نیند آرہی ہے۔سونے دیں۔بسمہ نے رکھائی سے

جواب دیتے ہوئے رخ پھیرلیا۔

تو کیا میری بیٹو کونہیں جاننا کہ اس کے دل میں کون اتنا شور مچائے ہوا ہے۔ مما نے چالاکی سے کہا۔

آپ کو پتہ ہے مما وہ کون ہے۔؟ بسمہ نے حیرانی سے مما کی طرف دیکھا۔

ہاں بالکل کیونکہ یہ اٹھا پٹک میرے بھی دل میں ہوتی ہے نا۔ مما نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

پر کیسے مما..... کون کرتا ہے۔؟ بسمہ نے سوال کیا۔

کوئی نہیں کرتا بیٹا۔ یہ ہمارے دل کی اپنی آواز ہوتی ہے۔ دیکھو ہمارے جسم کے سبھی حصوں کو صحیح سے کام کرنے کے لیے خون کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسکے لیے ہمارے بدن میں خون کی نالیاں بنی ہوتی ہیں۔ یہ نالیاں بدن میں ہر جگہ صاف خون پہنچاتی ہیں۔ لیکن ان نالیوں میں خون پہنچاتا کون ہے۔؟ تو یہ کام ہمارا دل کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ ہمارا دل خون کی نالیوں میں خون کو پمپ کرتا ہے۔ دل اور خون کی نالیوں کے بیچ ایک دروازہ لگا ہوا ہے جو بند رہتا ہے اور جب دل زور لگا کر اس دروازے کو کھولتا ہے تو کھٹاک کی ایک آواز پیدا ہوتی ہے۔ جیسے گھر میں کسی دروازہ کو زور سے کھولنے پر پیدا ہوتی ہے۔ اس آواز کو لب کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ سننے میں لب کی طرح سنائی دیتی ہے۔ اس دروازہ کے کھلتے ہی خون نالیوں میں تیزی سے داخل ہو جاتا ہے اور جسم کے ایک ایک حصہ تک پہنچ جاتا ہے۔ اور دوسری آواز جو دل کی ہمیں سنائی دیتی ہے اس کا نام ڈب ہے اور یہ تب سنائی دیتی ہے جب خون کی نالیاں پورے بدن سے گندا خون واپس دل میں لاتی ہیں۔ تاکہ ان کی صفائی ہو سکے اور پھر سے اسے کام میں لایا جا سکے۔ تو اسکے لیے بھی دل میں ایک دروازہ ہوتا ہے۔ یہ بھی بند رہتا ہے اور جب پیچھے سے گندا خون کا ریلا آتا ہے تو یہ کھٹاک سے کھل جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے دل کی دوسری آواز پیدا ہوتی ہے ڈب۔ عام زبان میں دل کی ان آوازوں کو دھڑکن کہتے ہیں اور جب گندا خون دل میں داخل ہو جاتا ہے۔ تو پھر دل اس گندے خون کو پھیپھڑوں میں بھیج دیتا ہے۔ جہاں اس کی صفائی کا کام کیا جاتا ہے۔ وہاں سے خون کو صاف کر کے دوبارہ دل میں بھیجا جاتا ہے اور دل پھر سے اس کو خون کی نالیوں کے ذریعہ پورے بدن میں بھیج دیتا ہے۔ اس طرح یہ چکر چلتا رہتا ہے۔ اب دیکھو جتنی دیر میں میں نے تمھیں یہ سب بتایا اتنی دیر میں دل نے اپنا کام کتنی بار کر لیا ہوگا۔ عام طور سے ایک منٹ میں دل یہ کام 75 بار کرتا ہے۔

75 بار..... بسمہ حیران ہوکر بولی۔

ہاں۔ 75 بار۔ اور ہاں جب بھی ہم دوڑتے ہیں تو ہمارے دل کا یہ کام بڑھ جاتا ہے کیونکہ اس حالت میں بدن کو زیادہ جلدی جلدی صاف خون کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لیے ہمارے دل کی دھڑکن بھی بڑھ جاتی ہے اور ہمیں زیادہ سنائی دیتی ہے۔

ہاں تبھی تو آج جب میں کھیل میں دوڑ رہی تھی تو اور زیادہ بج رہا تھا۔۔ بسمہ نے معصومیت سے کہا۔

اچھا بیٹا اب تو سمجھ گئی کہ کون ہے اندر میں جو اتنا اٹھا پٹک کرتا ہے..... ہے نا..... مما نے پیار سے بسمہ سے پوچھا۔

ہاں سمجھ گئی مما۔ بسمہ کو اسکے سوال کا جواب مل گیا تھا۔

■

Bushra Arshad Temi
Salafia Medical College & Hospital
Darbhanga (Bihar)

فاطمہ شاہین

صاف صفائی

صاف صفائی کرلو بھائی
بیماری سے بچ لو بھائی
اپنے دانتوں کو تم مانجھو
ناخونوں کو اپنے کاٹو
کپڑے اپنے صاف کرو تم
بال پہ اپنے دھیان کرو تم

صاف صفائی کرلو بھائی
بیماری سے بچ لو بھائی
کاغذ پھاڑ کے کوڑا کرنا
یہ تو اچھی بات نہیں ہے
اپنا مکتب گندہ کرنا
یہ بھی اچھی بات نہیں ہے

صاف صفائی کرلو بھائی
بیماری سے بچ لو بھائی
کھانے سے پہلے نہ دھونا
کھانا کھاکر ہاتھ نہ دھونا
دونوں باتیں گندی باتیں
اچھی نہیں یہ دونوں باتیں

صاف صفائی کرلو بھائی
بیماری سے بچ لو بھائی
دانتوں میں داتون ہے کرنا
سونے سے پہلے ہے پڑھنا
پھر بستہ بھی ٹھیک ہے کرنا
صبح سویرے جلدی اٹھنا

صاف صفائی کرلو بھائی
بیماری سے بچ لو بھائی
آنکھوں کو پانی سے دھوکر
بیماری سے انھیں بچاؤ
دور سے دیکھو ٹی وی کو تم
پاس نہ اس کے ہرگز جاؤ

صاف صفائی کرلو بھائی
بیماری سے بچ لو بھائی

■

Fatima Shaheen
D-813, Karaily
Allahabad-(UP)

ریاض انور بلڈانوی

کتاب

میری ہم دم ہے جو ہے میری کتاب — اس کا ہم سر نہ کوئی اس کا جواب
اس کے دم سے ہے جگ میں اُجیارا — اس کا ممنون ہے جہاں سارا
اِس سے تہذیب سب نے سیکھی ہے — ہر بھلائی برائی پرکھی ہے
یہ ہر انسان کی ضرورت ہے — اس کی تحریر خوب صورت ہے
اس کا ہر لفظ ہیرا موتی ہے — یہ اندھیرے میں گویا جوتی ہے
اِس میں حکمت کے درس ہیں سارے — قیمتی قول اور فن پارے
زندگی کی حقیقتیں اِس میں — نیکیاں اور صداقتیں اس میں
بات ہر اک موتیوں کی لڑی — کامرانی ہر ایک اس سے جُڑی
راز انمول اس میں جیون کے — اور بیاں ہیں اُصول ہر فن کے
زندگی کی یہی ہے سچّی رفیق — سب کی ہمدرد اور سچی شفیق
دوست اس کو بناؤ تم اپنا — سکھ سے جیون بتاؤ تم اپنا
علم کی قدر جان لو بچو — راہ پر اس کو مان لو بچو

Riyazuddin Tamizuddin
Near Ahsan Kirana
Jauhar Nagar
Buldana - 443001 (Maharashtra)

افتخار احمد

دادی اقرا اور مریم مشکورہ

دادی اقرا کی عمر 70 سال تھی۔ دنیا میں وہ اکیلی تھی۔ ان کے شوہر اللہ رکھا ہر وقت تسبیح کرتے رہنے کی وجہ سے دادا اللہ کے نام سے مشہور تھے۔ وہ دس سال قبل اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ ان کو کوئی اولاد نہ تھی مگر الحمدللہ انھیں روپوں، پیسوں کی کوئی کمی نہ تھی کیونکہ ان کے پاس ایک مرغی تھی جو ہر روز سونے کا ایک انڈا دیتی تھی۔ چونکہ اکیلی جان تھی لہٰذا ایک انڈا انھیں سال بھر کافی ہوتا تھا۔ باقی انڈے وہ روزانہ غریبوں، مسکینوں اور حاجت مندوں، بیماروں میں بانٹ دیا کرتی تھیں۔ ان کے دروازے پر ضرورت مندوں کا ہجوم لگا رہتا تھا۔ ہر کوئی انھیں خوب خوب دعائیں دیتا تھا۔

ایک روز 6 سال کی ایک پیاری سانولی سی بچی آئی۔ وہ اتنی پیاری تھی کہ اسے دیکھتے ہی دادی اقرا نے اسے گود میں اٹھا کر چوم لیا پھر بولیں ’’بیٹا! آپ کا نام کیا ہے؟‘‘

اس نے جواب دیا ’’مریم مشکورہ‘‘

’’واہ! بھائی واہ!! جتنی پیاری گڑیا اتنا ہی پیارا نام!!!‘‘

دادی اقرا نے اسے بھی سونے کا ایک انڈا دیا۔

بدقسمتی سے کچھ روز بعد برڈ فلو نام کی ایک بیماری چلی جس کی لپیٹ میں آکر لاکھوں مرغیاں مر گئیں۔ ان میں دادی اقرا کی بھی مرغی تھی۔ دادی اقرا کو اپنی مرغی مرنے کا بڑا صدمہ ہوا کیونکہ اب وہ غریب نادار لوگوں کی مدد نہیں کر سکتی تھیں اور خود بھی محتاج ہو گئی تھیں۔

ایک دن وہ اداس اپنے برآمدے میں بیٹھی سامنے سڑک کو خالی خالی نظروں سے تک رہی تھیں اور وہ دن یاد کر رہی تھیں جب وہاں غریب حاجت مندوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ ان کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے۔ انھوں نے ہاتھ اٹھا کر اللہ سے گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں مانگنی شروع کر دیں۔ اے اللہ! تیری شان جل جل جلالہ! اپنے فضل و کرم سے پھر مجھے ویسی ہی سونے کا انڈا دینے والی مرغی عطا فرما دے۔ مجھے اپنے لیے کچھ بھی نہیں چاہیے۔ اس بار میں اس کا ایک انڈا بھی اپنے لیے نہ لوں گی۔ محنت، مزدوری کر کے اپنی ضرورت پوری کروں گی۔ مگر مجھے تیرے لاچار، مجبور، غریب مسکین، ضرورت مند بندوں کے لیے وہ مرغی دے دے آمین!‘‘

وہ دیر تک روتی رہیں گڑگڑاتی رہیں۔ پھر دعا سے فارغ ہوئیں تو دیکھا، ان کے گھر کے سامنے ایک سونے کی ٹم ٹم آ کھڑی ہوئی۔ اس میں سے ایک لڑکی اتری جس کے ہاتھ میں ایک سونے کی مرغی تھی۔

لڑکی سلام کر کے ان کے گھر میں داخل ہوئی تب دادی اقرا نے اسے پہچانا۔ وہ کوئی اور نہیں مریم مشکورہ تھی۔ دادی اقرا نے اسے گلے سے لگا لیا اور خوب خوب دعائیں دینے لگیں۔

مریم مشکورہ بولی ’’مرغی کی وفات کا سن کر مجھے بڑا رنج ہوا ہے۔ اللہ کی مرضی! آپ صبر کریں یہ ایک چھوٹی سی بھینٹ میں آپ کے لیے لائی ہوں۔ اسے قبول فرمائیں۔ مہربانی ہوگی۔‘‘

اتنا کہہ کر مشکورہ نے سونے کی مرغی دادی اقرا کے

ہاتھوں میں رکھ دی۔

''دادی! آپ کا دیا ہوا انڈا بازار میں بیچنے کی بجائے میں نے اس پر مرغی بیٹھا دی تھی۔ کچھ دنوں بعد اسی انڈے سے ایک مرغی کا بچہ نکلا جو بڑا ہو کر سونے کا انڈا دینے والی مرغی بن گیا۔ میں نے اس کے انڈوں کو اسے سینے دیا۔ اب میرے پاس درجنوں سونے کا انڈا دینے والی سنہری مرغیاں ہیں۔ میں آدھے انڈے ضرورت مندوں میں بانٹ دیتی ہوں، آدھے انڈوں پر مرغی بیٹھا کر سنہری مرغیاں حاصل کرتی ہوں۔ میرے پاس دن بدن سونے کا انڈا دینے والی سنہری مرغیاں بڑھتی جارہی ہیں۔'' دادی اقرا یہ سن کر بڑی خوش ہوئیں، بولیں ''واہ بھئی مشکورہ آپ تو بڑی چالاک نکلیں! میں تو صرف ایک انڈا روزانہ غریبوں میں بانٹ پاتی تھی تم تو بیسوں انڈے روز بانٹ رہی ہو۔'' پھر انھوں نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا ''میں بھی کتنی احمق تھی، میں نے کبھی ایسا کچھ سوچا کیوں نہیں تھا، ورنہ آج میرے پاس بھی درجنوں سنہری مرغیاں ہوتیں۔''

یہ سن کر مریم مشکورہ ہنس پڑی اور بولی 'دادی! میرے پاس جتنی ساری مرغیاں ہیں وہ سب آپ کی ہیں، آپ کہیں تو ساری کی ساری آپ کو ابھی بھجوا دوں۔ ویسے آپ بہت ذہین ہیں مگر آپ اس لیے مجھ جیسا نہ کر پائیں کیونکہ سونے کا انڈا ہاتھ میں آتے ہی آپ غریبوں میں اسے بانٹنے کے لیے اتاولی ہو جاتی تھیں۔ آپ بہت ہی رحم دل ہیں۔ آپ کا دل سونے کا ہے۔''

مشکورہ مریم کی پیار وعقیدت بھری باتوں سے دادی اقرا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آنسو پونچھتے ہوئے بولیں ''رہنے دے بیٹی، مرغیاں تیرے پاس رہیں یا میرے پاس، کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ غریبوں کی مدد یہاں سے ہو یا تیرے گھر سے، ایک ہی بات ہے۔ ویسے میں بھی تیری حکمت پر عمل کر کے ڈھیر ساری سنہری مرغیاں حاصل کروں گی۔''

دادی اقرا سے رخصت ہو کر مشکورہ مریم چل گئی۔

دادی نے سنہری مرغی کے انڈوں سے پہلے سنہری مرغیاں حاصل کرنی شروع کیں۔ جب درجنوں مرغیاں ہوگئیں تو انڈے بانٹنے شروع کر دیئے۔ اس طرح ایک سال گزر گئے۔

پھر ایک سال بعد دوبارہ برڈ فلو کی خطرناک وبا چلی۔ اس بار دادی اقرا کے ساتھ مشکورہ مریم کی بھی ساری مرغیاں لقمۂ اجل ہوگئیں۔ دونوں کو بے حد صدمہ ہوا۔ مریم مشکورہ تو زار و قطار رونے لگی۔ تب دادی اقرا نے اس کے آنسوؤں کو پوچھتے ہوئے کہا ''نا رو میرے جان! سونے کا انڈا دینے والی مرغی پھر آ جائے گی۔''

''مگر دادی کیسے؟ ہمارے پاس تو نا ایک بھی انڈا بچا ہے نا مرغی۔'' مشکورہ مریم نے سسکتے ہوئے کہا۔ دادی اقرا نے اسے ایک بیگ دیا۔ ''اس سے تجھے سونے کا انڈا دینے والی سنہری مرغی ملے گی۔'' مشکورہ مریم نے حیرت سے پوچھا ''دادی! یہ کیا ہے؟''

''یہ اسکول کا بستہ ہے، تو خوب دل لگا کر پڑھ! ڈگری حاصل کر اور ٹیچر بن کر اپنا سونے کا انڈا دینے والی سنہری مرغی حاصل کر لے۔ پھر تو بچوں کو پڑھا کر انھیں ڈاکٹر، وکیل، ٹیچر، انجینئر، سائنس داں بناتا کہ وہ کسی سونے کا انڈا دینے والی مرغی کے محتاج نہ رہیں۔ بلکہ خود پارس بن جائیں۔''

■

Dr. Iftekhar Ahmad
(Malegaon)

بانو سرتاج

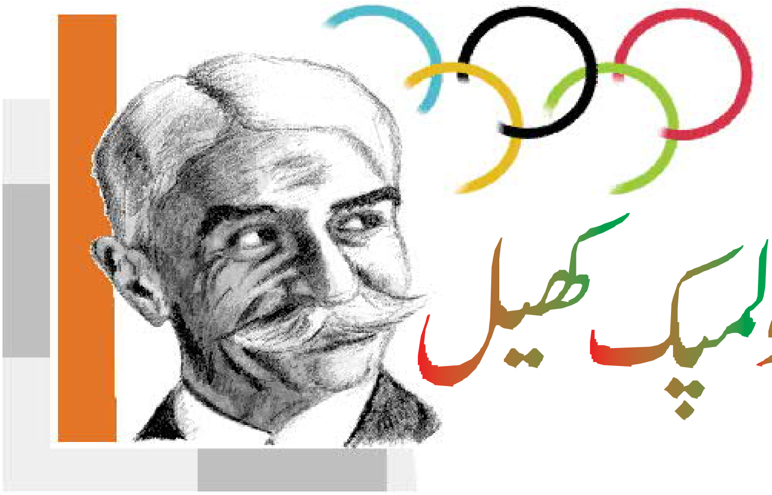

اولمپک کھیل

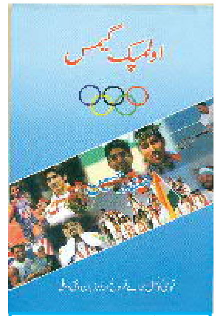

اولمپک گیمس پر قومی اردو کونسل کی شائع کردہ ایک اہم معلوماتی کتاب

اولمپک کھیلوں کا آغاز عیسیٰ سے آٹھ صدی قبل ملک یونان سے ہوا۔ برسوں تک ان کھیلوں کا انعقاد ہوتا رہا۔ رومن سلطنت پر جرمن کے قبائلیوں (Tiotorians) کا قبضہ ہونے کے بعد صورت حال بدل گئی۔ انھوں نے رومن سلطنت کو جڑ سے ختم کر دینے کے لیے رومن تہذیب کو ختم کرنا شروع کیا اور اسی سلسلے میں اولمپک کھیلوں کا نام و نشان مٹا دینے کے اقدامات کیے۔ اولمپک کھیلوں کا میدان، کھیل کا سامان، اولمپک میڈل، کھلاڑیوں کی تانبے کی مورتیاں سب کچھ ختم کر دیا۔ شہنشاہ تھیوڈورس (Theodorus) کے حکم سے اولمپک مشعل بھی بجھا دی گئی۔

صدیوں بعد فرانس کے ایک شخص نے دوبارہ ان کھیلوں کو شروع کروایا۔ اس شخص کا نام بیرن پیرے دی کبرتن (Baran Pierre De Coubertin) تھا۔ کبرتن کی انتھک کوششوں سے ماڈرن اولمپک کھیلوں کا آغاز مانا جاتا ہے۔ اس لیے انھیں اولمپکس کا بانی (Father of Modern Olypmpcs) کہا جاتا ہے۔

کبرتن یکم جنوری 1863 کو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاندان میں پیدا ہوئے۔ انھیں سینٹ سائرکی فوجی اکادمی میں اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیجا گیا مگر انھوں نے پولیٹکل سائنس مضمون پسند کیا اور ڈگری حاصل ہوتے ہی برطانیہ، امریکہ وغیرہ ممالک کی سیاحت پر نکل گئے۔

ایک جرمن ٹیم یونان کے قدیم شہر اولمپیا (Olympia) میں اُن دنوں کھدائی کر رہی تھی۔ اس ٹیم نے قدیم اولمپک (776 ق۔م سے 394 عیسوی تک) کھیلوں کے باقیات دریافت کیے۔ کبرتن نے اولمپیا کا دورہ کیا... اولمپک کھیلوں کی تاریخ سے وہ بے حد متاثر ہوئے۔ انھوں نے طے کیا کہ وہ ان شاندار کھیلوں کی شاندار روایت کو دوبارہ زندہ کریں گے۔ جنگوں سے پریشان دنیا ان کھیلوں کے ذریعے امن وسکون کی سانس لے گی۔

1892 میں انھیں موقع مل گیا۔ پیرس میں Athletic Sports Union کا پانچواں اجلاس منعقد ہوا جس میں کبرتن نے اولمپک کھیلوں کو دوبارہ شروع کرنے کی تجویز رکھ دی۔

تجویز پر غور وفکر کا آغاز ہوا۔ کافی وقت لگا مگر کبرتن اپنے موقف پہ ڈٹے رہے کہ انتشار اور پریشانی کے دور میں کھیلوں کا انعقاد ضروری ہے۔

دو برسوں بعد پیرس میں پھر تمام دنیا کے کھلاڑی جمع

ہوئے۔ انٹرنیشنل ایتھیلیٹک کانگریس (International Atheletic Congress) میں شریک ہونے آئے تمام غیرملکی نمائندوں سے کبرتن نے اس تجویز پر مدلل بحث کی۔ نتائج امیدا فزا نکلے۔ نہ صرف یہ کہ تجویز اکثریت رائے سے پاس ہوئی بلکہ اولمپک کمیٹی کی بھی تشکیل ہوگئی۔

یہ طے ہوگیا کہ پہلے اولمپک کھیل یونان ہی میں منعقد ہوں گے۔ یہ فیصلہ قطعی مناسب تھا کیونکہ یونان کے Corobus اور Millow جیسے نامور کھلاڑیوں ہی نے دنیا کو اولمپک کھیلوں سے روشناس کرایا تھا جو یونانی تھے۔

اولمپک کھیلوں کے لیے رقم کی فراہمی ایک بڑا مسئلہ تھی مگر آوارو فیسے (Awaro Fasey) نامی ایک بزنس مین نے یہ مشکل بھی آسان کردی۔

6 اپریل 1896 کو یونان کے شہنشاہ جارج اول نے اولمپک کھیلوں کا افتتاح کیا۔ صدیوں پرانی مشعل کو پھر سے روشن کیا گیا۔

اس طرح ایک شخص کی زندگی میں اس کا خواب پورا ہوگیا۔

عالمی بھائی چارہ (World Brotherhood)، دوستی (Friendship) اور خیرسگالی کا مظہر اولمپک کھیل میلہ، 1896 کے بعد سے ہر چار برس کے بعد لگنے لگا۔ بیسویں صدی میں دو جنگِ عظیم (اوّل و دوم) کے دوران ان کھیلوں کے انعقاد میں خلل پڑا مگر مشعل جلتی رہی۔ پھر کھیل معمول پر آ گئے۔

1913 میں اولمپک پرچم کا نشان کبرتن نے تیار کیا۔ پانچ براعظموں کے مظہر پانچ گولوں کو ایک دوسرے میں گونتھ دیا۔ اس وقت کبرتن نے کہا تھا:

''اولمپک کھیلوں میں اہم بات فتح حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ جدوجہد کرنا، کوشش کرنا اہم ہے۔ کسی کو شکست دینا اہم نہیں ہے بلکہ زندگی سے جوجھنا اہم ہے۔''

اولمپک کھیلوں کو دوبارہ زندہ کرنے اور ان کھیلوں کے

انعقاد کے ذریعہ امن قائم کرنے کی کوششوں کے لیے کبرتن کو 1912 کے سمر اولمپک میں اس کی نظم Ode to sport کے لیے سونے کا تمغہ انعام میں دیا گیا۔

دس برسوں بعد کبرتن اس دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے مگر تب تک اولمپک کی جڑیں گہری جم چکی تھیں۔

ابھینو بندرا

سنیل کمار

بھارت کے لیے پہلا اولمپک میڈل 1900 میں نارمن گلبرٹ پریچرڈ (Norman Gilbert Prichard) نے ریس میں جیتا تھا۔ برٹش انڈیا میں انھوں نے بھارت کی طرف سے اولمپک میں شامل ہوکر بھارت کے لیے دو میڈل جیتے تھے۔ ہندوستان نے سب سے پہلے اولمپک میں 1900 میں حصہ لیا تھا جس میں صرف ایک کھلاڑی نے شرکت کی تھی اور ایتھلیٹ میں دو میڈل (چاندی) حاصل کیے تھے۔ پہلی دفعہ 1920 میں اولمپک دستے نے ہندوستان کی طرف سے شرکت کی تھی اور اس کے بعد سارے اولمپک کھیلوں میں بھارت کی نمائندگی رہی ہے۔ اولمپک ہاکی میں ہندوستان کا دبدبہ رہا ہے۔ ہندوستان نے 12 اولمپک کھیلوں میں ہاکی کے زمرے میں کل 11 تمغے حاصل کیے ہیں۔

2012 میں ہندوستان کی جانب سے 83 افراد پر مشتمل دستے نے شرکت کی تھی اور چھ تمغے حاصل کیے تھے۔ اس میں سنیل کمار نے کشتی کے زمرے میں ایک چاندی کا اور ایک کانسے کا تمغہ حاصل کیا تھا۔ اس سال کے اولمپک کھیل برازیل کے ریوڈی جنریو میں منعقد ہوئے جس میں ہندوستان کی جانب سے ابھی تک کے سب سے بڑے دستے نے شرکت کی جو 124 لوگوں پر مشتمل تھا۔ اس دستے کی قیادت نشانے باز ابھینو بندرا نے کی۔ اس سال ہمارے ملک کی دو کھلاڑیوں نے اولمپک میں تمغے حاصل کیے۔ پی وی سندھو نے بیڈمنٹن میں چاندی کا اور ساکشی ملک نے کشتی میں کانسے کا تمغہ حاصل کیا ہے۔

پی وی سندھو

ساکشی ملک

■

Dr. Bano Sartaj
Opposite Akashwani, Civil Lines
Chandrapur - 442401 (Maharashtra)

محمد محب اللہ

ہمدرد

"**دلاور!** اس پلاٹ پر کام جاری رکھنا۔ یاد رہے کسی مزدور کی تنخواہ میں کمی نہیں ہونی چاہیے ساتھ ہی اگر کسی کی کوئی مجبوری ہو تو ضرور خبر کرنا۔ مجھے یہ بالکل پسند نہیں کہ غربت کی دلدل سے نکلنے والا شخص غریبوں کے خون پسینے سے اپنا محل تو تعمیر کرلے مگر بدلے میں ان مزدوروں کو ناامیدی کے سوا کچھ نہ ملے۔"

میں پندرہ دن کے لیے گاؤں جا رہا ہوں۔ ماں کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔

یہ کہتے ہوئے سوٹ کیس اٹھا کر ناصر اپنے دفتر سے نکل ہی رہا تھا کہ منگلو چاچا نے کہا:

"صاحب جی ایک 15 سال کا جوان لڑکا ریسپشن (استقبالیہ) پر کھڑا ہے۔ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

ناصر نے پوچھا: "اس سے پوچھا نہیں، کیا بات ہے؟"

منگلو چاچا نے جواب دیا: "وہ پڑھائی چھوڑ کر کام کی تلاش میں بھٹک رہا ہے۔ مگر بات کرنے سے لگتا ہے کہ وہ تیز اور ہونہار ہے۔"

ناصر نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"اسے پڑھائی نہیں چھوڑنی چاہیے تھی! خیر اسے بلاؤ۔ یہ کہہ کر ناصر واپس اپنے کیبن میں چلا آیا اور اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔"

منگلو چاچا لڑکے کو لے کر حاضر ہوا۔

لڑکے نے سلام دعا کے بعد ناصر کے سامنے اپنی بات

رکھی:

''میں ایک غریب ہوں، میرے کئی بھائی بہن ہیں اور والد کمائی سے لاچار ہیں۔ اس لیے میں نوکری کرنا چاہتا ہوں۔''

ناصر نے پوچھا: ''لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم پڑھائی کر رہے تھے اور ذہین بھی ہو۔ پھر پڑھائی کیوں نہیں کی؟''

لڑکے نے بڑی معصومیت کے ساتھ جواب دیا:

''اب آپ ہی بتایئے اب ایسی حالت میں میرا پڑھنا ضروری ہے یا گھر والوں کے جینے کے لیے بنیادی ضرورتیں پوری کرنا؟ میں ایک جوان ہوں۔ کام کر سکتا ہوں! تو پھر اپنے گھر والوں کے لیے نوکری کیوں نہ کروں۔ دو پیسے ملیں گے تو ان کو کچھ کھلاؤں گا۔ ورنہ ان کے بھیک مانگنے کی نوبت آئے گی، میں خود بھیک مانگ سکتا ہوں مگر میں اپنے والدین کو بھیک مانگتے نہیں دیکھ سکتا۔''

اس کی باتوں نے ناصر کو گویا جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور وہ اپنی ماضی کی یادوں میں کھو گیا۔

وہ پڑھنے میں تیز، بااخلاق اور ملنسار لڑکا تھا۔ اس کے والد اسے پڑھانا چاہتے تھے اس لیے اسے پٹنہ کے اچھے رہائشی اسکول میں بھیجا گیا تھا۔ جہاں وہ اب دسویں کلاس تک پہنچ چکا تھا۔ مگر ایک دن اس کے گھر سے ایک خط آیا جو اس کے لیے سر پر آسمان سے بجلی گرنے کے مانند تھا۔ خیر خیریت کے بعد خط میں لکھا تھا:

''تمھارا باپ اب بیماری کے سبب بہت معذور ہو گیا ہے، تھوڑا بہت وہ کما کر بھیجتا ہے جو گھر کے اتنے اخراجات کے سامنے اونٹ کے منہ میں زیرا کے مانند ہے۔ اب ہم لوگ تمہارے تعلیمی اخراجات کیا پورے کریں یہاں گھر پر ہم لوگوں کے لیے دو وقت کی روٹی بھی ملنا مشکل ہو رہا ہے۔ دن بہ دن قرض پہ قرض کا بوجھ اور اس کا بیاج الگ! ہم لوگ بہت مشکل میں ہیں۔ تمہاری پیاری دادی''

ناصر کا دل پوری طرح ٹوٹ چکا تھا وہ اور پڑھنا چاہتا تھا مگر جب بھی وہ لالٹین کے سامنے اپنی کتاب کھولتا اسے خط کے وہ سارے جملے کانٹے کی طرح اس کے جسم میں چبھتے ہوئے محسوس کرتا۔ وہ جلتے ہوئے لالٹین کو اپنا دل تصور کرنے لگا جس میں اس کا خون مٹی تیل کے مانند جل رہا تھا۔

دھیرے دھیرے پڑھائی سے اس کا دل ہٹنے لگا اور وہ زمانہ اسکالرشپ کا نہیں تھا یا اسے دیگر کسی کی جانب سے مالی امداد کا سہارا میسر نہیں تھا۔ پھر وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اب ان کتابوں کے اوراق پر لکھے ان حروف کو پڑھے اور اس کے گھر والے پریشان ہو کر اپنی زندگی تباہ کریں۔

پھر وہ کمائی کے طریقوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ کبھی سوچتا کسی دوکان میں نوکری کر لوں مگر وہاں تنخواہ مہینے پر ملے گی، کبھی سوچتا کہ گاڑی کا کنڈکٹر بن جاؤں یومیہ آمدنی ہوگی۔ مالک سے بول کر روزانہ پیسے لے لیا کروں گا۔ پھر سوچتا کہ نہیں اس میں بھی چاہے محنت کتنی بھی کر لوں متعین آمدنی ہوگی اور ماتحتی میں بھی رہنا ہوگا سو الگ۔ اس لیے سوچا کیوں نہ ڈرائیور بن جاؤں اور کرائے سے آٹو لے کر گاڑی چلاؤں۔ کرایہ دے کر جو بچا سو اپنا اور خوب محنت کروں گا اور اپنے والدین اور گھر والوں کا فوری سہارا بن جاؤں گا۔ اس طرح اس نے پٹنہ میں ہی اسکول چھوڑ کر ڈرائیونگ کرنا سیکھ لیا اس طرح وہ ایک اچھا ڈرائیور بن گیا اور کمانے لگا۔

کچھ دن بعد جب گھر آیا اور گھر والوں کو معلوم ہوا تو اس کے والد کو بڑی تکلیف ہوئی اس نے کہا:

''بیٹے میں مانتا ہوں کہ میں بہت غریب ہو گیا ہوں اور اب مجھ سے اتنا کام نہیں ہو پاتا مگر! میں ابھی مرا نہیں ہوں۔ پھر یہ کیا کہ تم نے پڑھائی ہی چھوڑ دی۔ صبر کرتے یہ مشکل کے دن تھے گزر جاتے''

ناصر نے کہا: ہاں ابا جان! اللہ تا دیر ہم پر آپ کا سایہ قائم رکھے۔ میں جانتا ہوں کہ اس سے آپ کو تکلیف پہنچی ہوگی۔ مگر میں کیا کرتا، میں آپ لوگوں کی پریشانی دیکھ نہیں سکتا۔ اللہ نے چاہا تو دھیرے دھیرے سارے قرض ادا ہو جائیں گے اور آپ کو بھی کام کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

ناصر گاڑی چلاتا رہا اور ایک ذمہ دار کی حیثیت سے اپنے اہل خانہ کی ضروریات پوری کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اب اس نے دھیرے دھیرے گاڑی چلانا چھوڑ کر تعمیر مکان کا کنٹریکٹ لینا شروع کر دیا اس طرح وہ بہت بڑا کانٹریکٹر اور بلڈر ہو گیا۔ ''حوصلہ بلڈر گروپس'' کے نام سے اس نے اپنی کمپنی کھولی اور نہ صرف اپنے لیے بلکہ وہ لوگوں کا بھی ہمدرد بن کر سامنے آیا۔

آج وہ ایک بہت بڑی کنسٹرکشن کمپنی کا مالک بن چکا تھا۔ اس دوران اس کے والد کا انتقال ہو گیا اور وہ اپنی ماں بہن اور بھائیوں کی کفالت اور ان کی پوری ذمہ داریوں کو بہ حسن و خوبی انجام دینے لگا۔

سر آپ کہاں کھو گئے؟ اس غریب لڑکے نے ٹیبل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

ہاں...... ہاں! تو تم کہہ رہے تھے...... کہ اپنی غربت کی وجہ سے پڑھنا نہیں چاہتے۔ خیر پریشان نہ ہو۔ ہمارے یہاں تو کوئی نوکری نہیں ہے البتہ تمھاری تعلیم کے سارے اخراجات اور گھر والوں کے لیے بھی حسب ضرورت ان کے اخراجات اب میں برداشت کروں گا۔

یہ سن کر اس کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔ اس نے تعجب بھرے انداز میں کہا:

ہاں! سر! کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ آپ میرے اور گھر والوں کے اخراجات برداشت کریں گے؟

ناصر نے کہا: ہاں! مگر اس کے بدلے مجھے کچھ چاہیے؟

لڑکا چونکا اور تجسس بھرے انداز میں پوچھا:

کیا؟......کیا سر؟ کیا چاہیے؟ میں تو کچھ دے نہیں سکتا!!

پھر ناصر نے کہا: تمہیں محنت سے اپنی تعلیم مکمل کرنی ہوگی اور اپنی پوری یکسوئی کے ساتھ ایک اچھا آفیسر بن کر دکھانا ہوگا۔ بولو راضی ہو؟

اس نے کہا: بالکل سر! آپ فرشتہ صفت انسان ہیں، ہمارے لیے مسیحا کے مانند ہیں۔ میں یقیناً آپ کی توقعات کے مطابق اپنی تعلیم مکمل کروں گا۔

ناصر نے اپنے منیجر کو بلا کر اس سے تفصیلات لے کر اس کے گھر ماہانہ رقم بھیجنے اور اس کے کسی اچھے اسکول میں داخلہ کی کارروائی مکمل کرنے کا حکم دیا۔

تبھی منگلو چاچا نے آواز دی:

حضور گاڑی آ گئی! اور ناصر کا سامان اٹھا کر گاڑی میں ڈالنے کے لیے چل پڑا۔

ناصر نے اس لڑکے سے کہا: ٹھیک ہے۔ اللہ حافظ! میں پندرہ دن کے لیے گھر جا رہا ہوں آنے کے بعد تم سے تمہارے اسکول میں ملوں گا۔

■

Md. Mohibbullah
D-319, Abul Fazal Enclave
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110025

مظہر الاسلام

امتحان

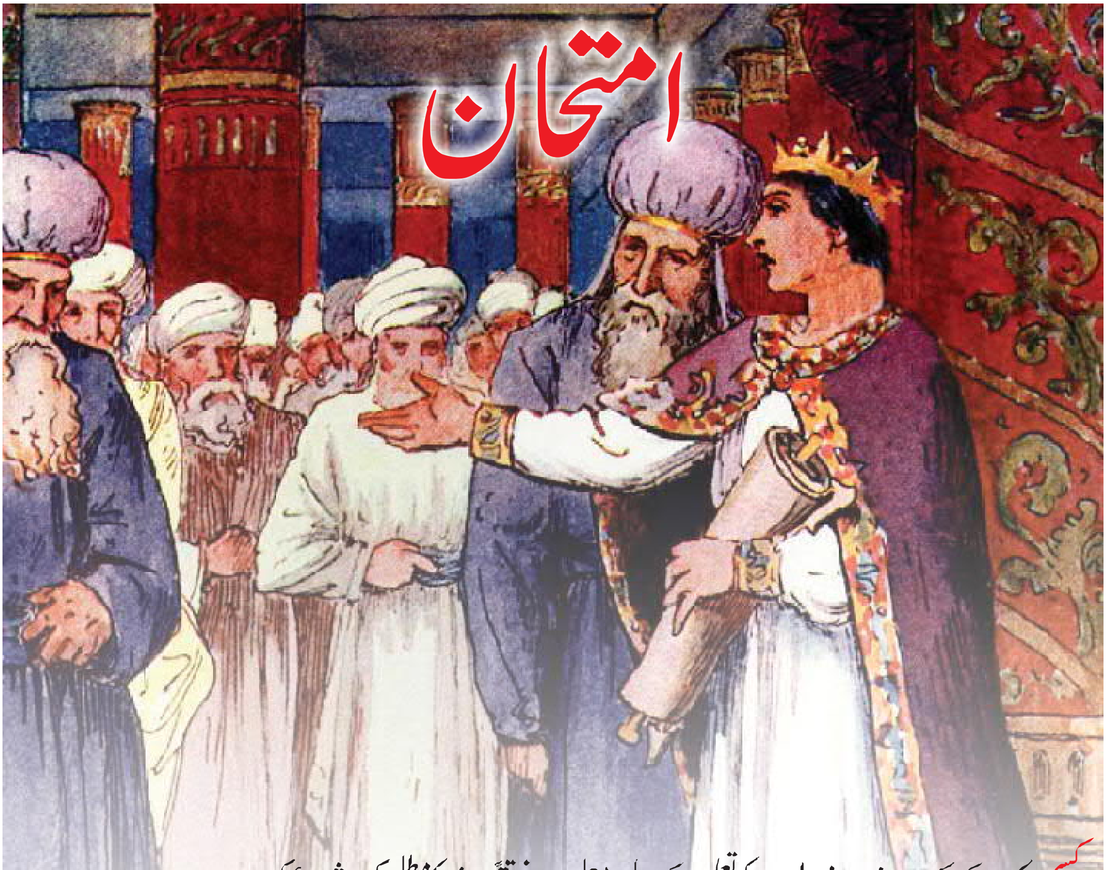

کسی ملک کے ایک بادشاہ نے ولی عہد کی تعلیم کے لیے معلم کا تقرر کیا۔ ہدایت دی گئی کہ ولی عہد کی تعلیم کے ساتھ ساتھ بہتر تربیت بھی ضروری ہے۔شہزادہ انتہائی لاپرواہ اور نافرمان اور کسی حد تک بے وقوف بھی تھا۔معلم شہزادہ کو چار یا پانچ گھنٹے پڑھاتا تھا۔انتہائی کوشش کے باوجود شہزادہ کوئی توجہ نہ دیتا۔

''جہاں پناہ... شہزادہ کی عدم دلچسپی تعلیم میں حائل ہے۔''

''آپ سے توقع کی جاتی ہے کہ پوری صلاحیت اور محنت سے آپ شہزادہ کی تعلیم جاری رکھیں گے... بادشاہ نے معلم کو تاکید کی۔ استاد کو اپنی نوکری کی فکر تھی اور اگر شہزادہ ترقی نہیں کر سکا تو اس کا انجام بھی معلوم تھا... اس لیے استاد نے وقتاً فوقتاً بادشاہ کو مطلع کرنا شروع کر دیا۔

''جہاں پناہ... مبارک ہو آج شہزادے نے امید سے کہیں بڑھ کر اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے۔''

ایک سال گزر گیا۔شہنشاہ نے حکم دیا کہ شہزادہ کی علمی صلاحیت کا امتحان لیا جائے۔بادشاہ نے ایک ممتحن کمیٹی بنائی۔ جس میں وہ بذات خود... چچا زاد بہن... اور دو ماہر تعلیم تھے۔

شہزادہ سے سوال کیا گیا— ''تین اور ایک کتنے ہوتے ہیں؟''

کچھ دیر سوچ کر جواب دیا'' کچھ یاد نہیں۔''

استاد محترم نے لقمہ دیا ''شہزادے تین اور ایک چار ہوتے ہیں۔''

شہزادہ... چند دن پہلے تو آپ کہتے تھے کہ دو اور دو چار

ہوتے ہیں اب ایک اور تین چار کیسے ہوگئے؟

بادشاہ نے غصہ سے کہا "نالائق اتنا بھی نہیں معلوم۔"

استاد خوف سے کانپنے لگا... بولا... جہاں پناہ اکثر بچے اتنے لوگوں کو دیکھ کر سب کچھ بھول جاتے ہیں... ہمارے شہزادے کے ساتھ بھی یہی کچھ ہے...

استاد کے لیے ایک موقع اور فراہم کیا گیا... معلم نے بے پناہ محنت کی شہزادے کی خوشامد کی... عالم پناہ کے عتاب کا واسطہ دیا... مگر بے سود۔ شہزادے کو سونے... کھانے... اور ٹافیاں چبانے سے ہی فرصت نہ تھی۔

درس و تدریس کے اوقات بڑھا دیئے گئے۔ اب شہزادہ کی تعلیم سات گھنٹے ہونے لگی۔ مگر شہزادہ ٹافیاں چبانے میں مشغول رہتا جسم موٹا ہوتا چلا گیا۔ کھانے پر بیٹھتا تو بے تحاشہ کھانا کھاتا۔ یہاں تک کہ سانس لینا دشوار ہو جاتا۔

امتحان کی تاریخ پھر مقرر کی گئی۔ ممتحن مقرر کیے گئے۔

استاد کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں نمایاں تھیں۔

ایک ممتحن "ہمیں ریاضی سے شروعات کرنی چاہیے۔

سوال — جان پدر — اگر تم کو چھ سیب دیے جائیں اور تم استاد کے ساتھ برابر بانٹ کر کھاؤ تو تم کتنے سیب کھاؤ گے؟

"یہ تو میرے لیے ناکافی ہوں گے— "شہزادے نے جواب دیا استاد کی پریشانی چہرہ پر عیاں تھی... اس بار کئی طرح کے سوالات اور ان کے جوابات رٹا دیئے گئے تھے کیونکہ اس بار بھی اگر جوابات صحیح نہیں دیے گئے تو گردن زدنی لازمی تھی۔ شاید جان ہی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ "اگر تم بانٹ کر کھاؤ تو تمھیں کتنے ملیں گے؟" دوبارہ پوچھا گیا۔

شہزادہ نے کچھ دیر سوچا اور کہا— دو!

استاد نے فوراً وضاحت کی۔ "جہاں پناہ... شہزادہ نے چار سیب ممتحن حضرات میں تقسیم کر دیے اور خود دو پر ہی اکتفا

کی۔ کہا جاسکتا ہے کہ شہزادہ بے حد فراخ دل ہے۔ وہ مل بانٹ کر کھانے میں یقین رکھتے ہیں۔''

پریشانی کے عالم میں استاد نے بادشاہ اور ممتحن حضرات کو دیکھا۔

استاد نے پھر تشریح کی ''اگر مجھے دو ملے۔ تو شہزادے کو چار اگر دو کو تین سے ضرب کیا جائے تو بھی جواب چھ ہے۔

استاد نے پیشانی سے پسینہ پوچھتے ہوئے کہا ''جہاں پناہ اب دیگر مضامین کا بھی رخ کیا جائے۔ کچھ سوالات حیوانات پر بھی پوچھے جائیں۔

ممتحن — کیڑے مکوڑوں میں اور گائے میں کون تیز دوڑ سکتا ہے۔

''گائے۔''

استاد نے تعریفی انداز میں دیکھا۔ درست!

''بتاؤ گھوڑے کی کتنی ٹانگیں ہوتی ہیں؟

پلک جھپکتے ہوئے شہزادہ نے جواب دیا' چھ'

''استاذ'' غضب کا جواب۔ کیونکہ دو ٹانگیں سوار کی بھی شمار کی جائیں گی۔''

اب جغرافیہ کی باری تھی۔

استاد نے ہکلاتے ہوئے شاہ سے درخواست کی جہاں پناہ وقت زیادہ ہو چکا ہے۔ اس لیے امتحان کل تک ملتوی کیا جائے۔

بادشاہ نے کڑک کر کہا ''امتحان جاری ہے۔''

ممتحن — ''کس راجدھانی میں جرمنی ہے۔''

کیک کھاتے ہوئے شہزادہ نے جواب دیا — ''لندن میں''

استاد نے فخریہ انداز میں اس طرح تشریح کی — ''جہاں پناہ اکثر ہٹلر کہا کرتا تھا کہ ''میں جرمنی ہوں اور جرمنی مجھ سے ہے۔ اور اس وقت ہٹلر لندن میں ہے۔ واہ کیا عقلمندی کا جواب دیا ہے۔

بادشاہ نے شہزادہ کے منہ پر زوردار طمانچہ رسید کیا اور غصہ میں کہا — امتحان ختم کیا جاتا ہے اور پھر معلم کی طرف دیکھ کر کہا ''اور آپ راجدھانی چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔''

استاد بادشاہ کے قدموں سے لپٹ گیا۔ ''عالم پناہ جان کی امان۔''

آپ کو ملک چھوڑنے کی اجازت نہیں۔ جب تک کہ شہزادہ اعلیٰ تعلیم نہ حاصل کرلے۔ شہزادہ کو الگ محل میں ڈال دیا جائے اور دوسرا معلم مقرر کیا جائے۔ جہاں اس کی سخت تربیت اور تعلیم ہوگی۔

استاد نے فریاد کی — رحم جہاں پناہ... مجھے گھر جانے کی اجازت دی جائے۔

بادشاہ نے حکم دیا ''تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ تمھیں ریاست اور شہنشاہ کا شہر خاص مقرر کیا جاتا ہے۔ جانتے ہو کیوں؟'' کیونکہ تم غلط کو صحیح اور صحیح کو غلط ثابت کرنے میں ماہر ہو۔ جب بھی ریاست میں ٹیکس بڑھائے جائیں تنخواہوں اور پنشن میں تخفیف کی جائے تو تم عوام کو بتاؤ گے کہ شاہی فیصلہ عوام کے حق میں ہے۔ تم ایک ناکام معلم ضرور ہو مگر عوام کو بخوبی گمراہ کر سکتے ہو۔''

استاد نے بادشاہ کے فہم کی داد دی... اور امتحان گاہ سے رخصت ہوا۔

■

Mazharul Islam
31, Behliman
Bulandshahar - 203011 (UP)

■ جمیلہ بی بی

کہانی

ایئرفون

کیا ہوا آٹو رکشا کیوں رک گیا؟ پیچھے کی سیٹ پر بیٹھا آصف دونوں کان میں ایئرفون لگائے ڈرائیور سے پوچھ رہا تھا۔

لگ رہا ہے کوئی گاڑی کے نیچے دب گیا ہے۔

اُف یہ لوگ بھی، اتنا کہہ کر آصف اپنے کان میں ایئرفون لگائے آرام سے سیٹ سے ٹیک لگا کر گانا سننے لگا۔ آٹو ڈرائیور نے بھی اس راستے کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کیا اور آٹو تیزی سے اپنی منزل کی جانب بڑھنے لگا۔

کالج کے گیٹ پر پہنچتے ہی آصف اشاروں ہی اشاروں میں اپنے دوستوں کو سلام کرتے ہوئے کلاس روم میں پہنچا۔

گڈ مارننگ سر!

گڈ مارننگ، ڈیئر اسٹوڈینٹ، آج ہمارے لکچر کا موضوع Today's India's Problems ہے اس بات سے آپ سبھی لوگ اچھی طرح واقف ہیں کہ ہمارے ملک کی موجودہ صورت حال کیا ہے اور اس کو کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جس سے روز بروز ہمارے ملک کی حالت خستہ ہوتی جارہی ہے۔

''اُف، کتنا بورنگ لکچر ہے۔ اس سے اچھا تو کوئی اچھی فلم کا گانا ہی سن لیتے۔'' دوسرے ہی پل آصف گانا سننے میں مصروف۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو اس اسٹائل سے دونوں کان پہ رکھا کہ سامنے والے کو معلوم پڑے کہ کتنی سنجیدگی سے لکچر سنا جارہا ہے۔ لکچر ختم ہوتے ہی سارے لوگ باہر نکلے اور ایک دوسرے سے اس طرح گلے ملنے لگے جیسے انھوں نے ابھی ابھی کسی بڑی پریشانی سے نجات پائی ہو۔

کتنا بکواس ہوتا ہے یہ لکچر۔ صحیح میں یار، اگر یہ ایئرفون نہیں ہوتا تو کیسے ہم ان ٹیچروں کو جھیلتے۔'' سچ کہہ رہے ہو آصف۔'' روی نے آصف کی ہاں میں ہاں ملائی۔

اس طرح سنجیدگی سے لکچر سنتے سنتے امتحان کے دن بھی قریب آ گئے۔

یار، روی کیا تم نے کچھ پڑھائی لکھائی بھی کی ہے یا یونہی امتحان میں شریک ہو جاؤ گے۔ سچ بتاؤں آصف جو تمھارا حال ہے وہی میرا بھی ہے اور تقریباً سبھی اسٹوڈینٹ کا یہی حال ہے۔

پھر بھی جب کچھ لکھیں گے تبھی تو پاس ہوں گے۔ میرے پلے تو کچھ بھی نہیں پڑ رہا ہے۔

تم فکر مت کرو، ہم سب پاس ہوں گے اور اچھے نمبروں سے ہوں گے۔

اچھا وہ کیسے؟

وہ یوں کہ سبھی ٹیچرس اپنی امیج بنانے کے لیے ہمیں اچھے

نمبر ضرور دیں گے۔

لیکن سارے ٹیچرس ایسے نہیں ہوتے ہیں، تم نے رحمٰن سر کے بارے میں کچھ سنا ہے۔ پچھلی مرتبہ انہوں نے زیادہ تر لوگوں کو فیل کر دیا تھا۔

معلوم ہے مجھے خوب اچھی طرح سے معلوم ہے۔ ان کے اس فعل پر مینجمنٹ کی جانب سے انھیں کتنا کچھ سننا پڑا تھا۔ یہ بھی معلوم ہے۔ دیکھنا اس سال وہ کسی کو فیل نہیں کریں گے۔

آصف کچھ راحت کی سانس لیتے ہوئے اگر ایسا ہوگا تو ہمیں اتنی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ارے ہاں کیا تمھارے پاس کوئی اچھی سی فلم کا گانا ہے؟

ہاں ہاں میرے پاس بہت سارے اسٹاک پڑے ہیں۔

تم ابھی لے لو، نیک کام میں دیر کیسی۔

امتحان ختم ہوا، رزلٹ بھی ملنے لگے۔ یار روی یہ رزلٹ تو دیکھو ہم دونوں پاس ہوگئے ہیں۔ چلو رحمٰن سر کو یہ خوشخبری دے کر آتے ہیں۔

اسلام علیکم سر! دونوں اپنے کانوں سے ایئر فون نکالتے ہوئے۔

وعلیکم السلام، کہیے کیا بات ہے؟

سر ہم لوگ پاس ہوگئے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ سر۔

رحمٰن سر نے بڑی ہی مایوسی سے ان دونوں کی طرف دیکھا اور کہنے لگے۔ دیکھو آصف اور روی آپ دونوں پاس کس طرح ہوئے ہیں اس بات کا علم آپ دونوں کو اچھی طرح سے ہوگا۔ اگر واقع میں دیکھا جائے تو آپ لوگ فیل ہونے کے بھی مستحق نہیں ہیں۔ آپ جیسے اسٹوڈینٹ کو تو دھکے مار کر کالج سے باہر کر دینا چاہیے۔ لیکن کہیں نہ کہیں آپ سب کے کیریئر کی فکر ستائے رہتی ہے اور یہ امید بندھی رہتی ہے کہ ایک نہ ایک دن آپ لوگ سدھر جائیں گے۔

سوری سر! آئندہ سے ایسی غلطی نہیں ہوگی، اس بار ہم ضرور محنت کریں گے، ایک بار پھر سے موقع دینے کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ۔

پڑھائی میں محنت تو آپ تبھی کریں گے جب آپ کے دماغ اور کان دونوں کلاس میں ہوں۔ رحمٰن سر بڑے ہی طنزیہ انداز میں دونوں کے ہاتھوں میں چھپے ہوئے ایئر فون کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

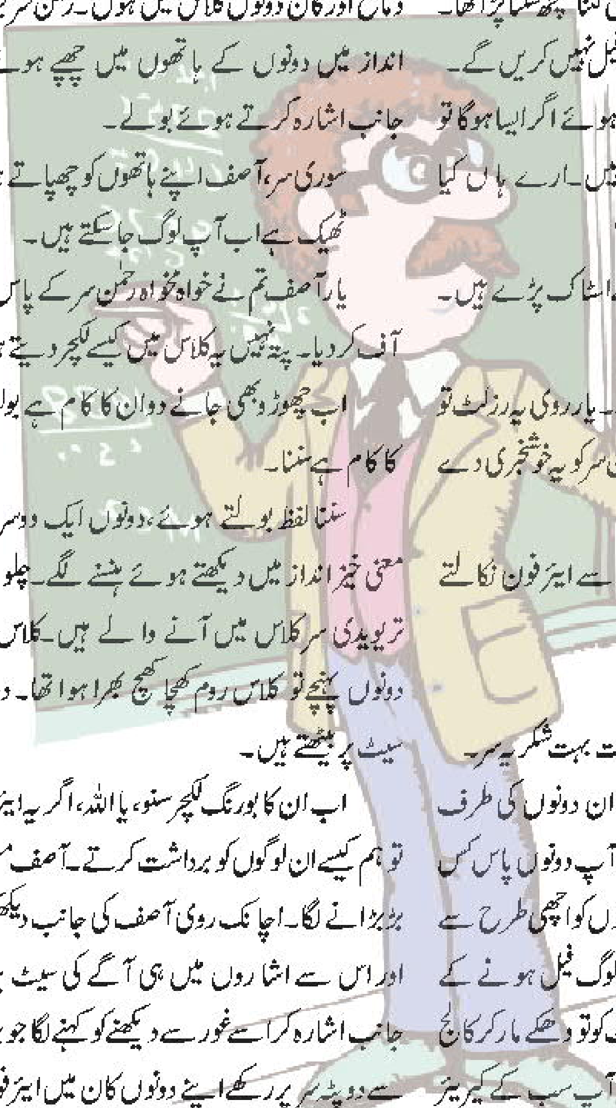

سوری سر، آصف اپنے ہاتھوں کو چھپاتے ہوئے۔

ٹھیک ہے اب آپ لوگ جا سکتے ہیں۔

یار آصف تم نے خواہ مخواہ رحمٰن سر کے پاس لے جا کر موڈ آف کر دیا۔ پتہ نہیں یہ کلاس میں کیسے لکچر دیتے ہوں گے۔

اب چھوڑو بھی جانے دو ان کا کام ہے بولنا اور ہم لوگوں کا کام ہے سننا۔

سننا لفظ بولتے ہوئے، دونوں ایک دوسرے کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھتے ہوئے ہنسنے لگے۔ چلو اب جلدی چلو ترویدی سر کلاس میں آنے والے ہیں۔ کلاس میں جب وہ دونوں پہنچے تو کلاس روم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ دونوں اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہیں۔

اب ان کا بورنگ لکچر سنو، یا اللہ، اگر یہ ایئر فون نہیں ہوتا تو ہم کیسے ان لوگوں کو برداشت کرتے۔ آصف من ہی من میں بڑبڑانے لگا۔ اچانک روی آصف کی جانب دیکھکر مسکرانے لگا اور اس سے اشاروں میں ہی آگے کی سیٹ پر بیٹھی سکینہ کی جانب اشارہ کرا کے غور سے دیکھنے کو کہنے لگا جو بڑے قاعدے سے دوپٹہ سر پر رکھے اپنے دونوں کان میں ایئر فون لگائے لکچر سننے میں مصروف تھی۔ اسے دیکھ کر آصف بھی مسکراتے ہوئے

اسی کی طرح نقل کر لیکچر سننے میں مصروف ہو گیا۔

فائنل امتحان ختم ہو گئے اور سب کو ڈگری بھی مل گئی۔

آصف خوشی خوشی یہ ڈگری اپنی ماں کو دکھانے کے لیے گھر گیا۔

دیکھیے امی جان مجھے ایم۔اے کی ڈگری بھی مل گئی۔

ہاں بیٹا آج میں بہت خوش ہوں خدا کا شکر ہے کہ تم نے آج ایم۔اے کی ڈگری حاصل کر لی۔اب تو یہی خواہش ہے کہ تجھے اچھی سی نوکری مل جائے اور ان بوڑھے ہاتھوں کو تھوڑا آرام ملے جو تمہارے ابو کے گذر جانے کے بعد جوانی سے اب تک لوگوں کے کپڑے سلتے سلتے تھک گئے ہیں۔آج اگر تیرے ابو ہوتے تو بہت خوش ہوتے کہ میرے بیٹے نے ایم۔اے پاس کر لیا ہے۔بیٹا اب جلدی سے تم نوکری کی تلاش میں لگ جاؤ۔

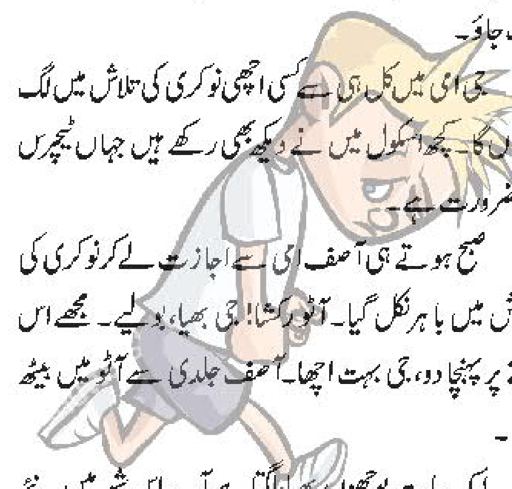

جی امی میں کل ہی سے کسی اچھی نوکری کی تلاش میں لگ جاؤں گا۔کچھ اسکول میں نے دیکھ بھی رکھے ہیں جہاں ٹیچرس کی ضرورت ہے۔

صبح ہوتے ہی آصف امی سے اجازت لے کر نوکری کی تلاش میں باہر نکل گیا۔آٹو رکشا! جی بھیا، بولیے۔ مجھے اس پتے پر پہنچا دو، جی بہت اچھا۔آصف جلدی سے آٹو میں بیٹھ گیا۔

ایک بات پوچھوں بھیا، لگتا ہے آپ اس شہر میں نئے آئے ہیں، آٹو چلاتے ہوئے ڈرائیور نے اس سے یہ بات پوچھی۔آصف نے جھلاّ کر کہا، کیا مطلب ہے تمہارا میں اس شہر میں دس سال سے رہ رہا ہوں کون سا سنیما ہال، کون سا مال کہاں پر ہے میں ابھی تمہیں بتا سکتا ہوں۔لیکن اس اسکول کے بارے میں مجھے نہیں پتہ ہے۔لیکن بھیا، اب بکواس مت کرو، ذرا جلدی آٹو چلاؤ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ جی صاحب۔

اسکول کے اندر پہونچتے ہی آصف نے چپراسی سے پرنسپل سے ملنے کی بات کہی۔

آپ یہیں بیٹھیے میں پرنسپل صاحب کو اطلاع دے کر آتا ہوں۔تھوڑی دیر بعد چپراسی آصف کے پاس آتا ہے اور اسے پرنسپل کے کمرے میں جانے کا اشارہ کرتا ہے۔

کیا میں اندر آ سکتا ہوں سر۔

یس پلیز، کم ان۔

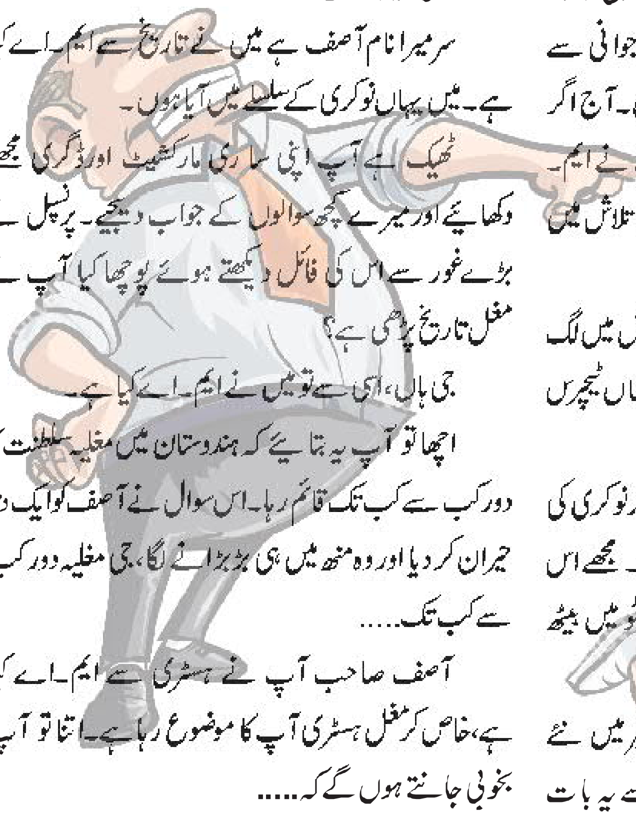

سر میرا نام آصف ہے میں نے تاریخ سے ایم۔اے کیا ہے۔میں یہاں نوکری کے سلسلے میں آیا ہوں۔

ٹھیک ہے آپ اپنی ساری مارکشیٹ اور ڈگری مجھے دکھائیے اور میرے کچھ سوالوں کے جواب دیجیے۔پرنسپل نے بڑے غور سے اس کی فائل دیکھتے ہوئے پوچھا کیا آپ نے مغل تاریخ پڑھی ہے؟

جی ہاں، اسی سے تو میں نے ایم۔اے کیا ہے۔

اچھا تو آپ یہ بتائیے کہ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا دور کب سے کب تک قائم رہا۔اس سوال نے آصف کو ایک دم حیران کر دیا اور وہ منھ میں ہی بڑبڑانے لگا، جی مغلیہ دور کب سے کب تک.....

آصف صاحب آپ نے ہسٹری سے ایم۔اے کیا ہے، خاص کر مغل ہسٹری آپ کا موضوع رہا ہے۔اتنا تو آپ بخوبی جانتے ہوں گے کہ.....

جی سر، لیکن اس وقت مجھے یہ دور یاد نہیں آ رہا ہے، آپ کوئی دوسرا سوال پوچھ لیجیے۔

ٹھیک ہے، کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ مغل حکومت کا آخری بادشاہ کون تھا اور اس نے کس جنگ میں حصہ لیا تھا؟

اب آصف کے چہرے پر پسینے کی بوندیں صاف صاف

نظر آنے لگیں۔ جی جنگ، بادشاہ.....

لگ رہا ہے آپ کو پیاس لگ رہی ہے، میں ابھی پانی منگواتا ہوں۔

چپراسی پانی لے کر حاضر ہوتا ہے اور آصف کو پانی کا گلاس تھمادیتا ہے۔ پرنسپل نے چپراسی سے آخری سوال پوچھ لیے۔

یہ کیسا سوال پوچھ رہے ہیں صاحب، میں نے صرف ہائی اسکول تک ہسٹری پڑھ رکھی ہے۔ پھر بھی میں بتانے کی کوشش کرتا ہوں۔

صاحب، ہندوستان میں آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر تھے جنھوں نے 1857 کی غدر میں حصہ لیا تھا۔

ٹھیک ہے اب تم جاسکتے ہو۔ جی صاحب

اب پرنسپل صاحب آصف کی جانب دیکھتے ہیں۔ دیکھیے آصف صاحب ہمارے یہاں ایک چپراسی بھی تھوڑا بہت جانتا ہے اس سے نیچے کی کوئی پوسٹ ہمارے یہاں نہیں ہے۔

آصف نے نہایت ہی شرمندگی سے اپنی فائل اٹھائی اور پھر وہ کسی دوسرے اسکول میں قسمت آزمانے کے لیے چل دیا مگر افسوس ہر جگہ اسے مایوسی ہی ہاتھ لگی۔ شام کو تھکا ہارا وہ واپس گھر آتا ہے۔ اس کی ماں بستر پر تیز بخار میں پڑی نظر آتی ہے۔ امی آپ کو تو تیز بخار ہے۔ میں ابھی دوا لے کر آتا ہوں۔

رہنے دو بیٹا یہ بیماری تو اب روز کی ہوچکی ہے تھوڑا آرام کرلوں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔ آج تم بڑی جلدی گھر آ گئے۔ کیا کوئی اچھی نوکری مل گئی ہے۔ نہیں امی میں کئی اسکول میں گیا لیکن کہیں نوکری نہیں ملی۔ صبر رکھو بیٹا اللہ تعالیٰ بہت مہربان ہے ایک دن تجھے نوکری ضرور مل جائے گی۔ جی امی میں کل پھر جاؤں گا۔ ہوسکتا ہے کل کہیں کوئی نوکری مل جائے۔

دوسری صبح آصف پھر اپنی فائل لے کر کئی گھنٹے نوکری کی تلاش میں ٹھوکر کھاتا رہا۔ آخر کار وہ مایوس ہو کر ایک چھوٹے سے اسکول میں پہونچتا ہے اور پرنسپل سے ملاقات کرتا ہے۔

پرنسپل صاحب میری ماں بہت بیمار ہے۔ مجھے ایک عدد نوکری دے دیجیے پھر چاہے وہ ایک چپراسی کی ہی کیوں نہ ہو، لفظ چپراسی کہتے ہوئے اس کے لب کپکپانے لگے۔ پرنسپل بڑی حیرانی سے اس کو اور اس کی فائل کو دیکھتا ہے۔ پھر کچھ سوچ کر اس کو کل آنے کے لیے کہتا ہے۔

بہت بہت شکریہ سر، میں کل میں ضرور آؤں گا۔ یہ کہتے ہوئے وہ فوراً باہر آ گیا اور آٹو پکڑ کر اس میں بیٹھ گیا۔ آج وہ اپنے کالج کے دنوں کو یاد کر اپنی ہی نظروں میں شرمندہ ہو رہا تھا۔ راستے بھر اسے رحمٰن سر کا چہرہ نظر آتا رہا، پھر اچانک اس کی نظر بغل میں بیٹھے ایک نوجوان پر پڑی جو اپنے دونوں کان میں ایئرفون لگائے ہر چیز سے بے پرواہ اپنے میں ہی کچھ گنگناتے جارہا تھا۔ اسے دیکھ کر آصف کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس لڑکے کی شکل میں وہ اپنے آپ کو دیکھنے لگا اور اس سے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اسے رحمٰن سر سے اس کی اور روی کی وہ ملاقات یاد آ گئی جب وہ دونوں پاس ہونے پر ان سے ملنے گئے تھے۔ اب وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے منھ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا لیکن اس کے رونے پر کسی کو کوئی فرق نہیں پڑ رہا ہے بغل میں لڑکا ویسے ہی آنکھیں بند کیے گانا سننے میں مصروف رہا اور آٹو رکشا بھی تیزی سے اپنی منزل کی جانب بڑھتا جارہا ہے۔

■

Jameela Bibi
Research Scholar, Dept of Urdu
Banaras Hindu University, Varanasi (UP)

■ ساحر داؤد نگری

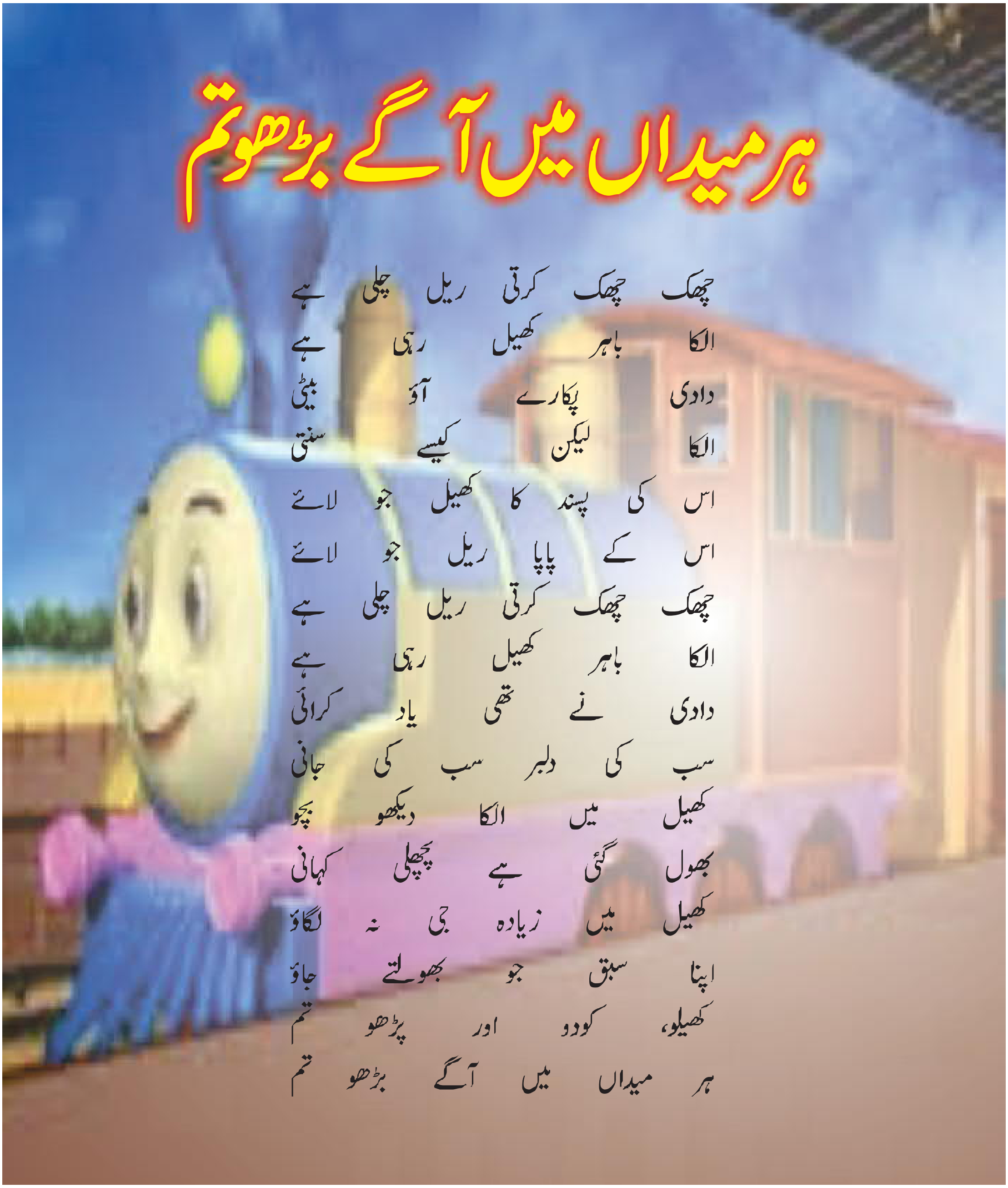

ہر میداں میں آگے بڑھو تم

چھک چھک کرتی ریل چلی ہے
الکا باہر کھیل رہی ہے
دادی پکارے آؤ بیٹی
الکا لیکن کیسے سنتی
اس کی پسند کا کھیل جو لائے
اس کے پاپا ریل جو لائے
چھک چھک کرتی ریل چلی ہے
الکا باہر کھیل رہی ہے
دادی نے تھی یاد کرائی
سب کی دلبر سب کی جانی
کھیل میں الکا دیکھو بچو
بھول گئی ہے پچھلی کہانی
کھیل میں زیادہ جی نہ لگاؤ
اپنا سبق جو بھولتے جاؤ
کھیلو، کودو اور پڑھو تم
ہر میداں میں آگے بڑھو تم

■

Sahir Daud Nagri
6/225, Lalita Park, Laxmi Nagar
New Delhi - 110092

حیدر بخش حیدری

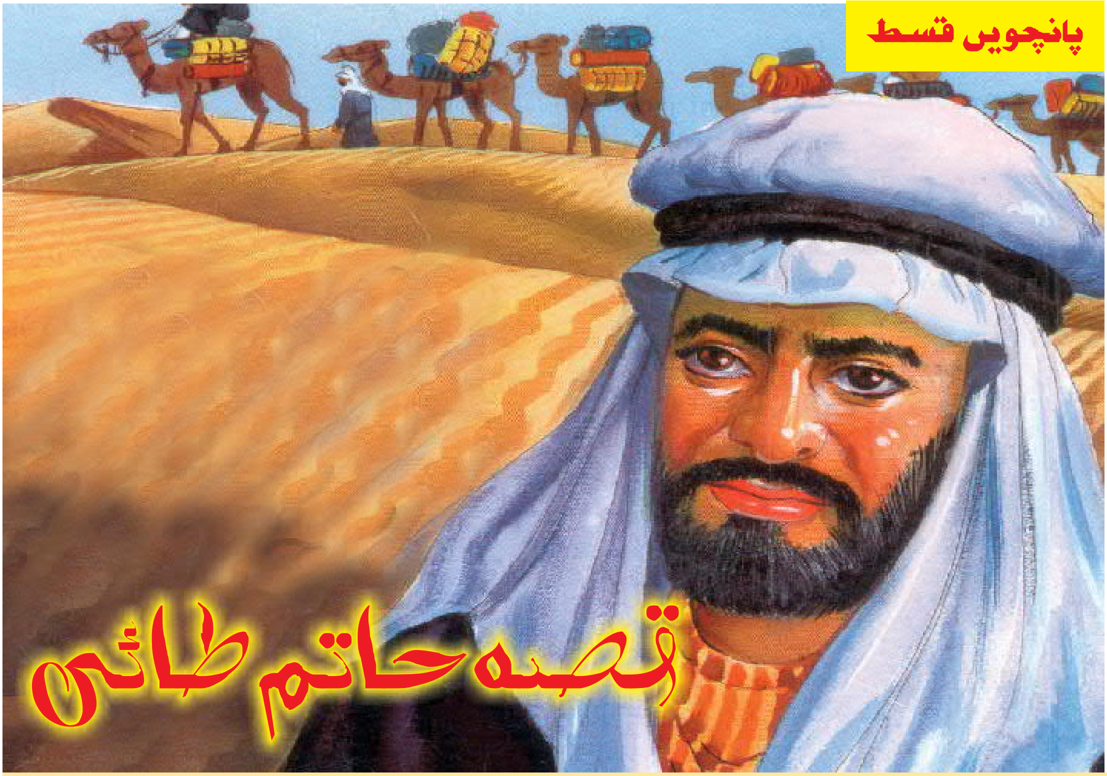

اب تک آپ نے پڑھا کہ

ملک یمن میں بادشاہ طے کا شریف اور سخی بیٹا حاتم تھا۔ وہ لوگوں کی بھلائی اور دوسروں کی مدد کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دیتا تھا۔ خراسان کے ایک سوداگر برزخ کی بیٹی حسن بانو کی خوب صورتی کے چہار سو چرچے تھے۔ برزخ نے مرنے سے پہلے اپنی بیٹی بادشاہ کو سونپ دی تھی۔ حسن بانو بڑی نیک دل تھی۔ اس نے اپنے سوداگر باپ کی دولت دونوں ہاتھوں سے تقسیم کرنی شروع کردی۔ یہ دیکھ کر اس کی دایہ نے اُسے روکا کہ ابھی تمہاری بہت لمبی عمر ہے ایسے دولت نہ ختم کرو۔ زندگی گزارنے کے لیے ایک شریک حیات کا انتخاب کرو۔ اچھے قابل اور بہادر انسان کی تلاش کے لیے سات سوال کرو۔ جو نوجوان سارے سوالات حل کر لے اُس سے شادی کرو اور چین وسکون کی زندگی گزارو۔ اسی بیچ ایک جعلی بزرگ نے حسن بانو کی ساری دولت لوٹ لی۔ حسن بانو نے جب بادشاہ سے شکایت کی تو بادشاہ نے اسے جھوٹا قرار دے کر شہر سے نکال دیا۔ حسن بانو اور اس کی بوڑھی دایہ ایک جنگل میں رہنے لگے۔ ایک رات حسن بانو کو خواب میں نظر آیا کہ جس درخت کے نیچے وہ سو رہی ہے وہاں سات بادشاہتوں کا خزانہ گڑا ہے۔ حسن بانو نے اٹھ کر دایہ کو اپنا خواب بتایا اور دونوں نے اس خزانے کو حاصل کیا اور جنگل میں عالی شان محل بنا کر رہنے لگیں۔ کچھ دنوں بعد حسن بانو نے ایک لڑکے کا بھیس بدلا اور خراسان کے بادشاہ سے ملاقات کی اور اپنی عقل مندی سے اُس جعلی پیر کی حقیقت سب کے سامنے لا دی۔ بادشاہ یہ سب جان کر بہت شرمندہ ہوا اور حسن بانو کی ساری دولت واپس کردی۔ حسن بانو اب ہنسی خوشی رہنے لگی اور اللہ کی راہ میں اپنی

دولت لٹانے لگی۔ شہر خوارزم کے شہزادے منیر شامی کو بھی حسن بانو کے حسن اور سخاوت کا علم ہوا۔ وہ حسن بانو کی محبت میں گرفتار ہو کر حسن بانو سے ملنے آ پہنچا اور اس سے شادی کی خواہش ظاہر کی۔ حسن بانو نے شرط رکھی کہ میرے ساتوں سوالوں کا جواب لا دو پھر میں تم سے شادی کروں گی۔ منیر شامی نے پہلا سوال دریافت کیا اور جواب ڈھونڈنے نکل پڑا لیکن وہ ناکام رہا۔ اس کی ملاقات حاتم سے ہوتی ہے۔ حاتم اسے دلاسا دیتا ہے اور حسن بانو کے پاس منیر شامی کو رکھ کر وہ پہلے سوال کا جواب لانے نکل پڑتا ہے۔

حاتم ایک جنگل میں پہنچا جہاں اُسے ایک ہرنی ملتی ہے۔ حاتم نے ایک بھیڑیے سے ہرنی کی جان بچائی اور آگے نکل گیا۔ اُس نے بعد میں ایک گیدڑ کی بھی مدد کی۔ گھنے جنگلوں میں حاتم ریچھوں سے گھر جاتا ہے۔ ریچھ کے بادشاہ نے اپنی بیٹی سے حاتم کی شادی کردی۔ کچھ مہینوں کے بعد حاتم نے وہاں سے دشت ہویدا کی راہ لی جہاں اسے پہلے سوال کا جواب ملنا تھا۔ بڑی مشکل سے حاتم دشت ہویدا پہنچا اور اس شخص سے ملاقات کی جو جنگل میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ حاتم نے اس کی مشکل آسان کردی اور پہلے سوال کا جواب تلاش کرلیا۔ حاتم واپس حسن بانو کے پاس آیا اور اُس سے دوسرا سوال پوچھا اور اس کا جواب لانے نکل پڑا۔

حاتم دوسرے سوال نیکی کر اور دریا میں ڈال کا جواب لانے نکل پڑا۔ راستے میں اُسے ایک نوجوان ملا۔ حاتم نے اپنی بہادری سے اس کی مشکل حل کی اور اس کی شادی کرائی۔ اس کے بعد حاتم آگے بڑھا۔ راستے میں اس نے ایک بستی والوں کو ایک بلا سے نجات دلائی۔ ایک شہزادی کو جن سے آزاد کرایا اور اس شہزادی سے شادی کرلی۔ اب آگے:

شادی کے بعد حاتم یوسف سوداگر کے کام کے لیے چین کی جانب چل پڑا اور یوسف سوداگر کی دولت زمین سے نکال کر خیرات کی اور اُس کو عزیزوں میں تقسیم کردی۔ واپس وہ یوسف سے ملنے آیا جہاں اب اس کی سزا ختم ہو چکی تھی۔ اس کے بعد حاتم نے سات چوروں کی مدد کی اور انھیں دولت دے کر چوری سے باز آنے کو کہا۔ حارس کی بیٹی کو جا کر بتایا کہ تیرے دو سوال پورے ہو چکے ہیں اور تیسرا سوال بتا۔ حاتم نے جلدی سے تیسرا سوال بھی پورا کردیا اور حارس کی بیٹی نے وعدے کے مطابق سوداگر کے لڑکے سے شادی کرلی۔ اس کے بعد حاتم نے نیکی کر اور دریا میں ڈال کا بھید معلوم کیا اور واپس جا کر حسن بانو سے ملا اور تیسرے سوال ''کسی سے بدی نہ کر۔ اگر کرے گا تو وہی پائے گا۔'' کا جواب لانے نکل پڑا۔

تیسرا سوال

حاتم کا جانا اور تیسرے سوال کا جواب لانا

اب حاتم تیسرے سوال کا جواب لانے کے لیے روانہ ہوا۔ کوئی مہینہ بھر چلا ہوگا کہ ایک پہاڑ دکھائی دیا جو آسمان سے باتیں کرتا تھا۔ اُس کی چوٹی پر ایک حسین جوان کھڑا تھا اور چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا: ''شتاب آ کہ نہیں تاب اب جدائی کی۔'' حاتم نے قریب جا کر رنج و غم کا سبب پوچھا۔ اُس جوان نے جھنجھلا کر کہا ''جا اپنا راستہ لے۔ جانے کتنے آئے اور سبب پوچھ پوچھ کر چلے گئے۔'' حاتم نے کہا ''اے عزیز! جب تو نے بہتوں کو اپنا دکھ درد بتایا ہے تو مجھے بھی بتا دے۔ شاید میں اللہ کی مدد سے تیری مشکل آسان کرسکوں۔''

جوان نے کہا ''اے مسافر! اگر تو جاننا ہی چاہتا ہے تو سن۔ میں ایک سوداگر ہوں۔ ایک دن اسی راستے سے گزر رہا تھا کہ الگن پری سے میری ملاقات ہوگئی۔ اُسے دیکھ کر میرا برا حال ہوگیا۔ ہوش وحواس جاتے رہے۔ وہ کسی طرح ہوش میں لائی اور بولی ''اے جوان! تو مجھے بہت اچھا لگا۔ جی چاہتا ہے کہ تو کچھ دن میرا مہمان رہے۔ مگر ایک شرط ہے۔ تجھے ایک ہفتے یہاں رہ کر میرا انتظار کرنا ہوگا۔ اس سے جدا ہونے کو جی تو نہ چاہتا تھا مگر پھر ملاقات ہونے کی اُمید پر میں نے یہ شرط منظور کر لی۔

اِس بات کو سات برس ہونے کو آئے۔ جب سے میں یہاں کھڑا اُس کا انتظار کر رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر پھر چیخ ماری اور وہی مصرعہ پڑھا:

شتاب آ کہ نہیں تاب اب جدائی کی

حاتم کو اس پر بڑا ترس آیا۔ بولا ''اے دوست! میری زندگی کا مقصد یہی ہے کہ دوسروں کے کام آؤں۔ تو میرا انتظار کر میں الگن پری کی تلاش میں روانہ ہوتا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو تیری مراد جلد پوری ہوگی۔''

اُسے دلا سا دے کر حاتم پریوں کے دیس کو روانہ ہوا۔ کئی دن چلنے کے بعد ایک باغ میں جا پہنچا۔ تھکا ہارا تو تھا ہی تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ آنکھ لگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد اٹھا تو دیکھا کہ چار پریاں سامنے بیٹھی ہیں۔ انھوں نے پوچھا ''تو کون ہے اور یہاں کیسے آیا ہے؟'' حاتم نے آنے کا سبب بیان کیا۔ پریاں ہنسنے لگیں۔ بولیں ''دیوانہ ہوا ہے۔ وہاں پہنچنا کوئی آسان کام ہے؟'' حاتم نے کہا ''آسان ہو یا مشکل مگر مجھے ضرور وہاں پہنچنا ہے۔ ایک اللہ کا بندہ مشکل میں پھنسا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اس کی مدد نہ کروں۔''

پریوں نے کہا ''اگر جان جوکھوں میں ڈالنا چاہتے ہو تو ضرور جاؤ۔ الگن پری کوہِ القا پر رہتی ہے۔ یہاں سے آٹھ دن چلو تو اُس کی سرحد پر جا پہنچو گے۔'' یہ سنتے ہی حاتم فوراً چل پڑا اور آٹھویں دن الگن پری کی سرحد میں جا پہنچا۔ سامنے ایک دوراہا تھا۔ عقل نے کام نہ کیا کہ کدھر جائے۔ اسی شش و پنج میں تھا کہ کہیں دور سے رونے پیٹنے کی آواز سنائی دی۔ حاتم آواز کی طرف چل پڑا لیکن رات کا وقت تھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کس کی

آواز ہے۔ ناچار صبح کا انتظار کرنے لگا۔ صبح کو پھر آواز کے سہارے چل نکلا۔ تھوڑی دور گیا ہوگا کہ دیکھتا ہے کہ ایک خوب صورت نوجوان ننگے سر ننگے پیر جنگل میں اِدھر اُدھر دوڑتا پھرتا ہے۔ ذرا ذرا دیر بعد رک جاتا ہے اور بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگتا ہے۔

حاتم نے اس نوجوان کے پاس جا کر رونے کا سبب پوچھا۔ اُس نے کہا ''میں ایک پردیسی ہوں۔ روزی کی تلاش میں گھر سے نکل کر یہاں آ پہنچا۔ یہاں ایک حسین عورت سے ملاقات ہوگئی۔ اُس نے بھی مجھے پسند کیا اور اپنے محل میں لے جا کر مہمان رکھا۔ اُس کا باپ ایک بڑا جادوگر تھا۔ اُس نے جادو کے زور سے پتہ لگا لیا کہ میں یہاں چھپا ہوا ہوں۔ ایک دن آ کر اپنی بیٹی پر بہت خفا ہوا۔ پھر مجھے بلا کر کہا کہ اگر میری بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہے تو میری تین شرطیں پوری کر۔ پہلی یہ کہ پری رو جانور کا ایک جوڑا لا کر دے، دوسری یہ کہ سرخ سانپ کا مہرہ لے کر آ۔ تیسری شرط یہ ہے کہ کھولتے تیل میں غوطہ لگا کر صحیح سلامت نکل آ۔ تو ہی بتا یہ شرطیں میں کیسے پوری کر سکتا ہوں۔ اس لیے اسے یاد کرتا ہوں اور روتا ہوں۔''

حاتم نے اُس کی ہمت بندھائی اور کہا کہ ''میں تیرے کام کی تدبیر کرتا ہوں۔'' حاتم جانتا تھا کہ پری رو جانور کا جوڑا دشتِ ماژندراں میں ملے گا۔ پہلے وہ اسی کے لیے روانہ ہوا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک قلعہ دکھائی دیا۔ قریب پہنچ کر دیکھا کہ لوگ اس کی خندق میں آگ جلا رہے ہیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ہر رات کو یہاں ایک بلا آتی ہے اور تین چار آدمیوں کو کھا جاتی ہے۔ حاتم نے کہا ''آج رات اُسے آنے دو۔ میں اس کا کچھ علاج کروں گا۔''

رات ہونے سے پہلے حاتم خندق کے پاس چھپ کر بیٹھ گیا۔ جب آدھی رات گزر گئی تو ایک جانور آتا دکھائی دیا، جس کے آٹھ پاؤں اور سات سر تھے۔ ایک سر ہاتھی کا اور چھ شیر کے۔ جو سر ہاتھی کا تھا اُس میں نو آنکھیں تھیں۔ ذرا سی دیر میں بلا بالکل قریب آ گئی۔ لوگوں نے لکڑیوں میں آگ لگا دی تو وہ بوکھلا کر اِدھر اُدھر دوڑنے لگی۔ اتنے میں وہ حاتم کے بالکل سامنے آ گئی۔ حاتم نے تاک کر آنکھ میں تیر مارا تو وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگی اور تھوڑی دیر میں وہ لوٹ لوٹ کر مرگئی۔

شہر کے لوگ بہت خوش ہوئے کہ حاتم کی بدولت بلا سے چھٹکارا ملا۔ سب نے چاہا کہ حاتم کو دھن دولت سے مالا مال کر دیں مگر حاتم نے کچھ قبول نہ کیا۔ سب محتاجوں میں بٹوا دیا اور سب سے درخواست کی کہ اللہ سے دعا کرو کہ وہ مجھے دین دنیا میں سرخرو کرے۔

حاتم ذرا آگے بڑھا تو ایک سانپ اور ایک نیولے کو آپس میں لڑتے ہوئے پایا۔ پوچھا ''تم میں ایسی کیا دشمنی ہے۔ کیوں لڑتے ہو؟'' سانپ نے کہا ''اِس نے میرے باپ کو مارا ہے۔ میں اِسے ماروں گا۔'' نیولا بولا ''یہ میری خوراک ہے۔ اِسے میں کھاؤں گا۔'' حاتم نے کہا ''تجھے اپنا پیٹ ہی تو بھرنا ہے۔ میرے گوشت سے بھر لے۔'' پھر سانپ سے بولا ''تجھے اپنے باپ کا بدلہ لینا ہے تو مجھ سے لے لے۔'' دونوں نے یہ سن کر لڑنا بند کر دیا۔ نیولے نے کہا ''تو مجھے اپنے گالوں کا گوشت کھانے کو دے۔'' حاتم نے فوراً تلوار نکال لی۔ قریب تھا کہ گوشت کاٹ ڈالے۔ اتنے میں نیولا چلایا۔ ''ٹھہر ٹھہر میں تو تیرا امتحان لیتا تھا۔ شاباش تیری ہمت کا کیا کہنا۔''

ذرا سی دیر میں سانپ اور نیولا لوٹ پوٹ کر آدمی کی شکل میں آ گئے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ حاتم بڑا حیران ہوا۔ پوچھا ''یہ کیا ماجرا ہے؟'' سانپ بولا ''اصل میں ہم دونوں جن ہیں۔

کا اثر نہ ہو۔ حاتم دونوں چیزیں لے کر رخصت ہوا۔

حاتم ابھی زیادہ دور نہ جانے پایا تھا کہ ایک دریا ملا۔ حاتم نے پانی میں وہ عصا ڈال دیا تو وہ فوراً کشتی بن گیا۔ اس طرح حاتم نے دریا پار کیا اور دشتِ ماژندراں کی طرف چل دیا۔ دو دن لگاتار چلنے کے بعد وہ منزل پر پہنچ گیا اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر سوچنے لگا کہ دشتِ ماژندراں تک پہنچ تو گیا مگر اب کیا کروں اور وہ جانور کا جوڑا کہاں ڈھونڈوں۔ اسی سوچ بچار میں نیند آ گئی اور پری رو جانور کا ایک جوڑا اُسی درخت پر بیٹھا۔ نر مادہ دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے۔ نر بولا ''آج رات اِس درخت کے نیچے حاتم طائی ہمارا مہمان ہے۔ اس نے دوسروں کے لیے اپنا آرام چین سب کچھ تج دیا ہے۔ ہر وقت یہی دھیان ہے کہ کس طرح کسی کے کام آؤں۔ اب اسے ہمارے جوڑے کی ضرورت پیش آئی ہے۔''
حاتم بھی نیچے لیٹا یہ ساری باتیں سنتا تھا۔

صبح ہوتے ہوتے بہت سے جانور وہاں جمع ہو گئے۔ سب نے کہا ''اے حاتم! یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج تو ہمارا مہمان ہے۔ ہمیں تیرے یہاں آنے کا سبب بھی معلوم ہے۔ ہم اپنے بچوں کا ایک جوڑا تیری خدمت میں پیش کرتے ہیں۔'' حاتم نے ان سب کا شکریہ ادا کیا اور کہا ''تمھاری اِس عنایت سے ایک نامراد اپنی مراد کو پہنچے گا۔'' غرض حاتم بچوں کا ایک جوڑا لے کر وہاں سے چل پڑا۔ یہ بھی سن لو کہ وہ جانور تھا عجیب۔ سر اور چہرہ آدمی کا سا اور گردن کے نیچے کا سارا دھڑ

میں نے اس کے باپ کو مار ڈالا کیونکہ وہ اپنی بیٹی سے میری شادی نہ کرتا تھا۔ یہ اُس کا بھائی ہے۔ یہ بھی شادی کے لیے رضامند نہیں ہوتا۔ میں اِسے بھی مار ڈالوں گا۔'' دوسرا بولا ''یہ اپنی بہن کی شادی مجھ سے کر دے تو میں اپنی بہن کی شادی اس سے کر دوں۔'' وہ جن جو پہلے نیولے کے روپ میں تھا، کہنے لگا ''کیا کروں میرے باپ کو یہ شادی منظور نہیں۔'' آخر حاتم نے جا کر اُسے راضی کیا اور ایک ہی دن میں دونوں کی شادی ہو گئی۔

شادی سے دونوں جن اتنے خوش ہوئے کہ دونوں نے حاتم کو ایک ایک تحفہ دیا۔ ایک نے عصا دیا۔ اس میں یہ کرامت تھی کہ سانپ بچھو کاٹے تو اثر نہ کرے، کسی دشمن کا جادو کارگر نہ ہو، اس کے سائے میں لیٹ جاؤ تو آگ سے نہ جلو، راستے میں دریا آ جائے تو اسے ڈال دو۔ ڈالتے ہی یہ کشتی بن جائے۔ دوسرے نے ایک مہرہ دیا جسے منہ میں رکھ لو تو سانپ کے کاٹے

بالکل مور جیسا۔

کافی لمبا سفر طے کر کے حاتم جادوگر کے شہر میں پہنچا اور سپاہی زادے کو وہ جوڑا دیا۔ جوان بہت خوش ہوا اور اسے لے کر فوراً جادوگر کے پاس پہنچا۔ اس نے کہا ''اب میرا دوسرا سوال پورا کر اور سرخ سانپ کا مہرہ لا کر دے۔'' سپاہی زادے نے یہ بات حاتم کے پاس جا کر دہرائی۔ اس نے کہا ''تو فکر نہ کر۔ اب میں اس کی کھوج میں نکلتا ہوں اور کوہِ قاف جا کر دشتِ سرخ سے وہ مہرہ لے کر آتا ہوں۔''

دو ایک دن آرام کرنے کے بعد حاتم مہرے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ منزلیں طے کرتا ہوا ایک جنگل میں جا پہنچا۔ وہاں ایک بچھو دیکھا جس کا قد مرغ کے برابر تھا اور جسم سات رنگ کا تھا۔ اتنے میں رات ہوگئی۔ حاتم ایک درخت کے نیچے لیٹ رہا۔ اس کے پاس گائیں اور گھوڑے وغیرہ گھاس چر رہے تھے۔ وہی بچھو نکلا اور اس نے ڈنک مار مار کر سب کو مار دیا اور خود ایک پتھر کے نیچے چھپ رہا۔ صبح کو لوگ وہاں جمع ہوگئے۔ بچھو پھر نکلا اور اس نے ایک آدمی کے ڈنک مارا۔ وہ بیچارہ گر کر تڑپنے لگا۔ اب بچھو نے جنگل کی راہ لی۔

حاتم بھی بچھو کے پیچھے پیچھے چلا۔ ذرا آگے چل کر بچھو لوٹ پوٹ کر سانپ بن گیا اور بل میں جا گھسا۔ رات ہوئی تو پھر نکلا اور شہر کی طرف چل دیا۔ آخر موری کے راستے سے شاہی محل میں داخل ہوگیا اور اس نے وہاں بادشاہ کو ڈس لیا۔ وہاں سے نکل کر وزیر کی حویلی میں گھس گیا اور اُس کی بیٹی کو ختم کر دیا۔ پھر سیدھا جنگل کا راستہ لیا۔ جنگل میں پہنچ کر اس نے شیر کا روپ اختیار کر لیا۔ دریا کے کنارے کچھ لوگ پانی پیتے تھے ان پر جھپٹا اور ایک کو پھاڑ ڈالا۔ وہاں سے آگے بڑھا تو ایک خوب صورت عورت بن کر سڑک کے کنارے بیٹھ رہا۔ ادھر سے دو نوجوان روزگار کی تلاش میں گزرے۔ اس نے ان دونوں سے بڑی محبت کی باتیں کیں۔ پھر جانے کیا لگائی بجھائی کی کہ دونوں لڑ پڑے اور لڑتے لڑتے مارے گئے۔ اب وہ عورت بھیس بدل کر بھینس بن گئی اور ایک گاؤں میں داخل ہو کر کئی آدمیوں اور بچوں کو روند ڈالا۔ وہاں سے دوڑتی ہوئی جنگل میں پہنچی اور آخر ایک بوڑھے آدمی کی شکل اختیار کر لی۔

اب حاتم سے نہ رہا گیا۔ اس نے سوچا کہ اس کا حال جاننا چاہیے۔ یہ سوچ کر آگے بڑھا اور جھک کر سلام کیا۔ اس بزرگ نے کہا ''کہو حاتم! خیر تو ہے۔ اچھے ہو۔'' حاتم بڑا حیران ہوا اور پوچھا ''اے بزرگ! تمھیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟'' اس نے جواب دیا ''تیرا کیا، مجھے تیری سات پشتوں کے نام معلوم ہیں۔ میں سبھی کو جانتا ہوں۔ شاید تجھے معلوم نہیں۔ میں موت کا فرشتہ ہوں۔ جس کی شکل میں جس کی جان لینے کا حکم ہوتا ہے وہی شکل بنا کر اس کی جان لے لیتا ہوں۔'' حاتم نے کہا ''یہ بتائیے میری موت کب آئے گی؟'' اس نے جواب دیا ''اے نیک دل انسان! ابھی تیری زندگی کے بہت دن باقی ہیں۔ ابھی تو تیرے ہاتھوں سے ہزاروں کے بگڑے کام بنیں گے۔''

یہ سن کر حاتم نے خدا کا شکر ادا کیا اور دشتِ سرخ کی راہ لی۔ آخر چلتے چلتے ایسی جگہ جا پہنچا جہاں کی زمین گہرے کالے رنگ کی تھی۔ اصل میں یہ کالے ناگوں کا ملک تھا۔ آدمی کی بو پا کر سانپ نکل آئے اور چاروں طرف سے حاتم کو گھیر لیا۔ حاتم نے وہ عصا زمین میں گاڑ دیا۔ سانپ جہاں تھے وہیں رک گئے اور آخر اپنے بلوں میں جا گھسے۔ حاتم آگے بڑھ گیا اور دشتِ سفید میں جا پہنچا۔ یہاں کے سفید سانپ بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔

حاتم آگے بڑھا تو دشتِ سرخ سامنے تھا۔ یہاں کی زمین خون کی طرح لال تھی۔ گرمی ایسی تھی کہ پیاس کے مارے حاتم

کی زبان نکل پڑی۔ سمجھا بس اب موت سر پر منڈلا رہی ہے۔ آخر بے دم ہو کر گر پڑا۔ ہوش و حواس جاتے رہے۔ اتنے میں ایک بزرگ سامنے آئے اور کہا ”اے حاتم! ہمت نہ ہار۔ وہ مہرہ منہ میں ڈال لے۔“ حاتم نے ایسا ہی کیا۔ پیاس کی شدت کم ہوگئی۔ حاتم نے بزرگ سے پوچھا ”یہ گرمی کس چیز کی ہے؟“ اس نے کہا ”یہ گرمی سرخ سانپ کے زہر کی ہے۔ پہلے یہ زمین سبز تھی مگر اب گرمی سے لال ہوگئی ہے۔“

مہرے نے اپنا کرشمہ دکھایا اور حاتم چلنے کے قابل ہوگیا۔ آگے چلا تو سرخ سانپ بو پا کر نکل آیا اور پھنکارنے لگا۔ اس کے منہ سے شعلے نکل کر آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ آس پاس کی ہر چیز شعلوں کی لپیٹ میں آگئی۔ حاتم کے منہ میں مہرہ نہ ہوتا تو جل کر راکھ ہوجاتا۔

حاتم نے عصا زمین میں گاڑ دیا اور رات اسی طرح گزار دی۔ صبح ہوتے ہوتے عصا کی برکت سے سانپ کی حالت غیر ہوگئی اور وہ مہرہ اگل کر بھاگ گیا۔ حاتم نے اسے پگڑی میں رکھا اور لاکر نوجوان کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آگئے۔ حاتم کے قدموں پر گر پڑا۔ حاتم نے اسے اٹھا کر گلے سے لگا لیا اور کہا کہ ”اب جادوگر کے پاس جا اور کہہ کہ اب تیسرے سوال کا جواب بھی حاضر ہے۔ کڑھاؤ میں تیل گرم کرائے۔“

کڑھاؤ میں تیل گرم ہوگیا تو حاتم نے مہرہ اُس نوجوان کے منہ میں ڈال دیا اور اُسے کھولتے تیل میں ڈلوا دیا۔ اللہ کی مہربانی اور مہرے کی برکت سے وہ صحیح سالم باہر نکل آیا۔ جس نے یہ کرشمہ دیکھا حیران رہ گیا۔ چند دن میں نوجوان کی شادی جادوگر کی بیٹی سے ہوگئی۔

ان سے رخصت ہوکر حاتم الگن پری کی تلاش میں کوہِ القا کی طرف چلا۔ پہاڑ پر پہنچ کر ایک غار دکھائی دیا۔ حاتم ایک چکنی ڈھلان کے سہارے پھسلتا پھسلتا تہہ تک پہنچ گیا۔ سامنے ایک

خوب صورت باغ تھا۔ پرندے چہچہا رہے تھے۔ اتنے میں کچھ پری زاد اس کے پاس آئے اور کہنے لگے ''اے آدم زاد! یہ باغ الگن پری کا ہے، تو اِس میں کہاں آ نکلا۔ اُسے خبر ہوگئی تو جیتا نہ چھوڑے گی۔ ہمیں سزا الگ ملے گی۔''

حاتم نے جواب دیا ''دوستو! میں موت سے ڈرنے والا نہیں۔ میں تو خود اس سے ملنے آیا ہوں۔'' پری زادوں نے سبب پوچھا تو حاتم نے سارا قصہ سنایا اور کہا ''میں اسے وعدہ یاد دلانے آیا ہوں۔'' پری زادوں کو ہمدردی پیدا ہوئی۔ الگن پری دو دن بعد وہاں آنے والی تھی۔ اس لیے انھوں نے حاتم کو باغ میں ہی چھپا دیا۔

دو دن بعد الگن پری پریوں کے جھرمٹ میں وہاں آئی۔ دربانوں نے عرض کیا ''اے شہزادی! ایک آدم زاد کسی طرح اِس باغ میں داخل ہوگیا ہے۔ ہزار سمجھایا مگر وہ یہاں سے جانے کے لیے راضی نہیں ہوتا اور کہتا ہے شہزادی سے ملے بغیر ہرگز نہ جاؤں گا۔'' شہزادی نے آدم زاد کو پیش کرنے کا حکم دیا اور اس سے آنے کا سبب پوچھا۔ حاتم نے شہزادی کو اُس کا وعدہ یاد دلایا اور کہا ''تیری جدائی میں کسی غریب کی جان جاتی ہے اور تجھے ترس نہیں آتا۔'' شہزادی نے کہا ''میں بھلا کسی سے جھوٹا وعدہ کیوں کرتی؟''

حاتم نے کہا ''شہزادی! خفا ہونے کی بات نہیں۔ میں جو کچھ عرض کررہا ہوں وہ سچ ہے۔ میرا نام حاتم ہے۔ جھوٹ بولنا میرا کام نہیں۔'' حاتم کے یاد دلانے پر پری کو واقعہ تو سارا یاد آ گیا مگر بگڑ کر کہنے لگی ''آخر تو کیوں دنیا کا دکھ درد بٹاتا پھرتا ہے۔ جا اپنا کام کر۔'' مگر حاتم نہ مانا اور اس نے پری کو اس طرح قائل کیا کہ وہ اس نوجوان کو بلانے اور شادی کرنے پر مجبور ہوگئی۔

اب حاتم وہاں سے رخصت ہوا اور کوہِ احمر پر پہنچ گیا۔ جس آواز کی کھوج میں یہاں آیا تھا اب وہ سنائی دے رہی تھی۔ کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا: ''کسی سے بدی نہ کر۔ اگر کرے گا تو وہی پائے گا۔'' حاتم آواز کے سہارے چلتا رہا۔ قریب پہنچا تو دیکھا کہ درخت میں ایک لوہے کا پنجرا ٹنگا ہوا ہے اور اُس میں ایک بوڑھا آدمی بند ہے۔

حاتم حیران ہوکر اسے دیکھتا رہا۔ پھر قریب جا کر پوچھا ''اے بزرگ! تو کون ہے؟ کس نے تجھ پر یہ ظلم کیا ہے؟ اور اس آواز کا کیا مطلب ہے؟'' بوڑھے نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی اور بولا ''اے مسافر! میری کہانی بڑی دکھ بھری ہے۔ تو سن کر کیا کرے گا لیکن پوچھتا ہی ہے تو سن اور سبق لے۔ میں ایک سوداگر ہوں۔ احمر میرا نام ہے۔ میرا باپ بڑا دھن دولت چھوڑ کر مرا۔ کچھ ہی دن میں میں نے سب اڑا دیا اور آخر کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گیا۔

اسی حالت میں میری ملاقات ایک نوجوان سے ہوئی۔ وہ گڑے خزانے کا پتہ بتا سکتا تھا۔ مگر شرط یہ تھی کہ چوتھائی اُس کا ہوگا۔ میں نے سوچا شاید میرے باپ نے کچھ زمین میں دفن کیا ہو۔ یہ سوچ کر میں اسے اپنے گھر لے گیا۔ اُس کے بتانے پر واقعی بے شمار دولت نکلی مگر میری نیت خراب ہوگئی۔ اُسے تھوڑا سا دیا اور گھر سے نکال دیا۔

ایک دن وہ نوجوان بھیس بدل کر پھر آیا اور بولا ''مجھے ایسا علم آتا ہے جس سے زمین پر گڑے خزانے نظر آجاتے ہیں۔'' میں نے کہا ''مجھے وہ علم سکھا دو۔ منہ مانگا انعام دوں گا۔'' اس نے کہا ''جنگل میں چلو۔ وہاں تمھاری آنکھوں میں ایک سرمہ لگا دوں گا۔ چودہ طبق روشن ہوجائیں گے۔'' میں خوشی خوشی اس کے ساتھ یہاں آ گیا۔ اس نے سرمہ لگایا تو میری دونوں آنکھیں بے نور ہوگئیں۔ اس کے بعد اس نے پنجرے میں بند کر کے مجھے یہاں ٹانگ دیا اور بولا ''جھوٹوں کی سزا یہی ہے۔ اب تو اپنی آنکھوں کی روشنی چاہتا ہے تو ہر وقت چلاّ چلاّ کر یہ کہا کہ ''کسی سے بدی نہ کر۔ اگر کرے گا تو وہی پائے گا۔''

''چلتے وقت اُس نوجوان نے کہا'' مدت کے بعد حاتم نام کا ایک جوان یہاں آئے گا وہ نوریز گھاس کا عرق لا کر ٹپکائے گا تب تیری آنکھیں روشن ہوں گی، اے عزیز! تیس سال بیت گئے کہ میں حاتم کا انتظار کر رہا ہوں۔ نہ جانے وہ کب آئے گا اور میری مشکل کب آسان ہوگی۔'' حاتم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بولا ''اطمینان رکھ۔ میں ہی حاتم ہوں۔ میں ابھی نوریز گھاس کی تلاش میں روانہ ہوتا ہوں۔''

یہ کہہ کر حاتم اس گھاس کی تلاش میں روانہ ہوا۔ سات دن کے بعد حاتم کو ایک خوشبو دار گھاس نظر آئی۔ سمجھ گیا کہ یہی وہ گھاس ہے جس کی تلاش تھی۔ وہ لے کر لوٹا اور اس کا رس بوڑھے قیدی کی آنکھوں میں ٹپکایا۔ فوراً کھوئی ہوئی روشنی لوٹ آئی۔ بوڑھا حاتم کے قدموں پر گر پڑا۔ بہت بہت شکریہ ادا کیا اور حاتم کو انعام دینا چاہا مگر اس کو کس چیز کی ضرورت تھی۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔

حاتم نے بزرگ کو خدا حافظ کہا اور شاہ آباد کی طرف چلا۔ وہاں پہنچ کر پہلے سرائے میں گیا اور منیر شامی کو لے کر حسن بانو کے پاس پہنچا اور اس کے سوال کا جواب پیش کر دیا۔ پھر پوچھا ''اب بتاؤ تمھارا چوتھا سوال کیا ہے؟''

(جاری)

■

ماخذ: حاتم طائی کا قصہ، **مرتب:** نورالحسن نقوی، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

■ محسن خان

عیسٰی کی سائیکل

عیسٰی کی امی عیسٰی کے پاپا
عیسٰی کے نانا عیسٰی کے دادا
سب نے کیا ہے عیسٰی سے وعدہ
جب وہ چلے گا پیروں پہ اپنے
دیکھے گا پیارے رنگین سپنے
چھوٹی سی سائیکل اس کو ملے گی
اس کو بٹھا کر جب وہ چلے گی
آنگن سے کمروں سے گزرے گی
باغ کے پھولوں سے باتیں کرے گی
چھوٹی سے کنڈی آگے لگے گی
عیسٰی کی امی عیسٰی کی فیڈر
خوب سجا کر اس میں رکھے گی

عیسٰی کے نانا عیسٰی کے دادا
بیٹھیں گے پیچھے دھکا بھی دیں گے
نانا گریں گے دادا گریں گے
عیسٰی کے ہمراہ سب ہی ہنسیں گے
عیسٰی کی سائیکل سب سے نرالی
عیسٰی کے ساتھی اس کے سوالی
اللہ میاں سے شکوہ کریں گے
اللہ میاں کب ان کو بھی دیں گے
عیسٰی جیسی سائیکل

■

Mohsin Khan
5, ShankarPuri, Phool Bagh
Lucknow - 226001(UP)

کہکشاں

چمن چمن کے پھول

اب بھی دماغِ رفتہ ہمارا ہے عرش پر
گو آسماں نے خاک میں ہم کو ملا دیا

(میر تقی میرؔ)

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پاسکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

(خواجہ میر درد)

اک ہمیں خار تھے آنکھوں میں سبھی کے سو چلے
بلبو خوش رہو اب تم گل و گلزار کے ساتھ

(شیخ قیام الدین قائم)

اس قدر اہلِ جہاں کو ہے محبت زر کی
پیٹ میں مارتے سونے کا جو خنجر ہوتا

(خواجہ حیدر علی آتش)

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
رو کر گزار یا اسے ہنس کر گزار دے

(ذوق)

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

(مومن خاں مومن)

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

(شیفتہ)

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

(اقبال)

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

(اقبال)

اے بادِ بیابانی مجھ کو بھی عنایت ہو
خاموشی و دل سوزی سرمستی و رعنائی

(اقبال)

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

(فانی بدایونی)

اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل
ہم وہ نہیں کہ جن کو زمانہ بنا گیا

(جگر مراد آبادی)

آڑے آیا نہ کوئی مشکل میں
مشورے دے کے ہٹ گئے احباب

(شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی)

ابھی کچھ اور ہو انسان کا لہو پانی
ابھی حیات کے چہرے پہ آب و تاب نہیں

(تاجور)

اک فقط مظلوم کا نالہ رسا ہوتا نہیں
اے خدا دنیا میں تیری ورنہ کیا ہوتا نہیں
(بال مکند عرش)

اک شجر ایسا محبت کا لگایا جائے
جس کا ہمسائے کے آنگن میں بھی سایا جائے
(ظفر زیدی)

کہہ رہا ہے شورِ دریا سے سمندر کا سکوت
جس میں جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے
(ناطق لکھنوی)

یہ سورج بھی بسا اوقات کارآمد نہیں ہوتا
اندھیروں سے نکلنے کے لیے بینائی کافی ہے
(نامعلوم)

چاند کا کردار اپنایا ہے ہم نے دوستو
داغ اپنے پاس رکھے روشنی بانٹا کیے
(حفیظ میرٹھی)

یہی ہے محبت، یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں
(حالی)

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں
(اقبال)

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں
(اقبال)

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا
(اقبال)

غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے
(غالب)

جوابات

انصاری ثناء فردوس محمد صادق انصاری

دوست اور دوستی

(1) اچھا دوست ایک پھول کی مانند ہوتا ہے جسے ہم چھوڑ بھی نہیں سکتے اور توڑ بھی نہیں سکتے توڑ دیا تو مرجھا جائے گا اور چھوڑ دیا تو کوئی اور لے جائے گا۔

(2) وقت، دوست اور رشتے یہ وہ چیزیں ہیں جو ہمیں مفت میں ملتی ہیں مگر ان کی قیمت کا پتہ جب چلتا ہے جب وہ کھو جاتی ہے۔

(3) جب آپ عروج پر ہوتے ہیں تو آپ کے دوستوں کو پتہ چلتا ہے آپ کون ہیں اور جب آپ زوال پر ہوتے ہیں تو آپ کو پتہ چلتا ہے کہ دوست کون ہے؟

(4) دوست وہ ہے جو دوست کا ہاتھ اس کی پریشانی میں اور مصیبت میں پکڑتا ہے۔

(5) اچھا دوست خدا کی نعمت ہے۔

(6) بہترین دوست وہ ہے جو تجھے تیری غلطیوں سے آگاہ کرتا ہے۔

(7) اپنی زندگی میں ایسے دوست کو شامل کرو جو کبھی آئینہ اور کبھی سایہ بن کر رہیں کیونکہ آئینہ جھوٹ نہیں بولتا اور سایہ ساتھ نہیں چھوڑتا۔

(8) دوست ایک پرانی کتاب کی طرح ہے جو کتنی ہی پرانی کیوں نہ ہو لیکن اُس کے الفاظ نہیں بدلیں گے۔

(9) ایک اچھا دوست ہزار برے دوستوں سے بہتر ہے۔

(10) سچا دوست دو جسموں میں ایک روح کی طرح ہوتا ہے۔

(11) دوستی میں پرخلوص رہو مگر کبھی کبھی دوست کے اخلاص کو آزما لیا کرو۔

■

Ansari Sana Firdaus Mohd Sadiq Ansari
Dargah Mohalla Pathri
Distt.: Parbhani (Maharashtra)

اقوال زریں

(1) زندگی کے ہر قدم پر پھول بکھیرو۔ کسی دن باغ لگا ہوا پاؤ گے۔

(2) صبر ایک ایسی سواری ہے جو اپنے سوار کو کبھی گرنے نہیں دیتی۔ نہ کسی کے قدموں میں نہ کسی کی نظروں میں۔

(3) کسی کے آنسو کو زمین پر گرنے سے پہلے اپنے دامن میں جذب کرلو۔ یہی انسانیت کی معراج ہے۔

(4) جب تم جان جاؤ کہ اللہ تمھارے ساتھ ہے تو پھر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کون تمھارے خلاف ہے۔

(5) دلوں میں اترنے کے لیے سیڑھیوں کی نہیں بلکہ اچھے اخلاق کی ضرورت ہوتی ہے۔

■

قاضی عفیفہ ناز ڈاکٹر توصیف
Kazi Afifa Naaz Dr. Tausif
Kazi Mohalla, Shirpur - 425405
Distt.: Dhule

محمد قیوم میو

تاریخی معلومات

تاج محل

اُتر پردیش ہندوستان میں بمقام شہر آگرہ ایک قلعہ کے اندر یہ مقبرہ واقع ہے جس کی تعمیر مغل بادشاہ شاہ جہاں نے اپنی بیوی ملکہ ممتاز محل کی محبت میں کرائی تھی۔ تاج محل مغل طرزِ تعمیر کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس کی تعمیر 1632-1653 میں ہوئی۔ اِس کی اونچائی 561 فٹ ہے۔ اس عظیم عمارت کے فن کار استاد احمد لاہوری تھے۔ اس کی تعمیراتی طرز میں ترک، فارسی، ہندوستانی اور اسلامی طرز تعمیر کے اجزاء کا انوکھا ملاپ نظر آتا ہے۔ 1983 میں اسے اقوام متحدہ کے ادارہ برائے تعلیم، سائنس اور کلچر نے عالمی ثقافتی ورثے میں شمار کیا۔ مغلوں کی تاریخ کی نہ صرف عظیم نشانی ہے بلکہ ہماری گنگا جمنی تہذیب اور عالمی محبت و بھائی چارہ کا سنگم ہے جہاں آج بھی لاکھوں کی تعداد میں ملک و بیرون ملک کے سیاح محبت کی ایسی عظیم علامت کے دیدار کے لیے بے چین رہتے ہیں۔ اب تک دنیا کی سیکڑوں عظیم سیاسی وسماجی شخصیات یہاں آچکی ہیں۔

جامع مسجد

جامع مسجد مغل حکمراں شاہ جہاں نے 1656 میں دارالحکومت دہلی میں بنوائی۔ ہندوستان کی عظیم جامع مسجد 'مسجد جہاں نما' سے موسوم تھی لیکن اب 'جامع مسجد' ہی کہلاتی ہے۔ اس میں 25,000 ہزار نمازی بیک وقت نماز ادا کرسکتے ہیں۔ یہ تین دروازوں، دو عالی شان میناروں اور تین گنبدوں پر مشتمل ہے۔ شاہ جہاں کے زمانے سے ہی ایک معروف مہاجر خاندان جو کہ بخارا سے دہلی منتقل ہوا تھا۔ اُس کی امامت پر مامور ہے۔ جامع مسجد کے امام کو شاہی امام کہا جاتا ہے۔ جامع مسجد سیاحوں کے لیے ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ گردشِ ایام کے نشیب وفراز سے گزرتے ہوئے جامع مسجد نے بہت لمبا سفر طے کیا اور آج بھی اپنی آب وتاب کے ساتھ یہ مسجد مغلیہ طرز تعمیر کا شاندار نمونہ ہے۔

لال قلعہ

لال قلعہ دہلی میں دریائے جمنا کے کنارے جامع مسجد کے بالمقابل واقع ہے۔ یہ مغلیہ عہد سلطنت کے دور کی عظیم یادگار رہے۔ اسے 1648 میں شاہ جہاں نے بنوایا تھا۔ اس کا استعمال شاہجہاں بادشاہ نے اپنے دارالحکومت کے طور پر کیا تھا جوکہ بعد میں 1857 سے 1947 تک انگریزوں کے قبضہ میں رہا۔ 15 اگست کو ہر سال ہمارے وزیراعظم یہیں سے ترنگا لہراتے ہیں اور ہندوستانی عوام سے خطاب کرتے ہیں۔ صدیوں سے یہ مغلیہ عہد سلطنت اور ہندوستانی مسلمانوں کی ایک فخریہ نشانی کے ساتھ وطن عزیز کا ایک عظیم تاریخی ورثہ ہے۔ ہندوستان میں تقریباً ہزار سالہ حکومت کی یہ عظیم یادگار رہے۔

آگرہ کا قلعہ

آگرہ کا قلعہ بھی مغل طرزِ تعمیر کا عمدہ نمونہ ہے۔ اسے لال قلعہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ سب سے پہلے چوہان راجاؤں کے پاس تھا اور 1080 کے آس پاس اس کی پہلے پہل تعمیر ہوئی۔ بعد میں سکندر لودھی نے اس قلعے کو اپنے قبضے میں کیا۔ سکندر لودی کے بعد یہ قلعہ ابراہیم لودی، بابر، ہمایوں، شیر شاہ اور پھر اکبر کے قبضے میں آیا۔ اکبر نے اس قلعے کو نئے سرے سے بنوایا اور نئی پہچان عطا کی۔ یہ قلعہ 1573 میں بن کر تیار ہوا۔ آگرہ

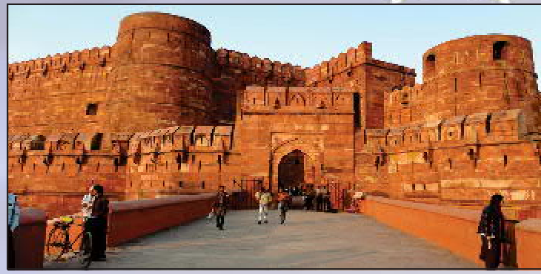

کے قلعے کو 2004 میں آغا خاں آرکیٹیکچر ایوارڈ بھی دیا گیا۔ یونیسکو کی عالمی ثقافتی ورثے کی فہرست میں درج عمارتوں میں آگرہ کا قلعہ بھی شامل ہے۔

بلند دروازہ

یوپی کے ضلع (آگرہ) میں فتح پور سیکری نامی مقام پر 1576 میں اکبر نے (بلند دروازہ) نام سے ایک عظیم و بلند دروازہ کی تعمیر کرائی۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا دروازہ ہونے کے

ساتھ مغل فن تعمیر کی زندہ مثال ہے۔

یہاں چشتیہ سلسلے کے معروف صوفی بزرگ سلیم چشتی کا مزار بھی ہے جہاں پورے ملک سے زائرین تشریف لاتے ہیں۔ اس دروازہ کی سطح زمین سے اونچائی 54 میٹر ہے جو کہ تقریباً 15 منزلہ عمارت کے برابر اونچا ہے۔ مسلسل بارہ سالوں کی شدید محنت کے بعد یہ دروازہ پایۂ تکمیل کو پہنچا اور یقیناً آج تک یہ مغلوں کی عظمت کی گواہی دے رہا ہے۔

قطب مینار

72.5 میٹر (234 فٹ) لمبا قطب مینار دنیا کا سب سے بڑا سرخ اینٹوں سے تیار کیا گیا مینار ہے۔ یہ مینار قطب الدین ایبک کے ذریعہ 'مسجد قوت الاسلام' کے مینار کے طور پر تعمیر ہوا۔ اس کی تعمیر 1193 میں شروع ہوئی۔

افغانستان کے جامی مینار سے متاثر ہوکر قطب الدین ایبک نے اس کی تعمیر کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کی زندگی میں صرف بنیادی کام ہوا لیکن بعد میں اس کے جانشین التمش نے تین منازل جبکہ فیروز شاہ تغلق نے پانچویں اور آخری منزل مکمل کروائی۔ سرخ اینٹوں سے بنے اس مینار کے اندر 379 سیڑھیاں ہیں۔ یہ دنیا کا واحد ایسا مینار ہے جو کسی اور عمارت یا کسی سہارے کے بغیر کھڑا کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کو سب سے بڑا آزاد مینار کہا گیا ہے۔ جنوبی دہلی میں مہرولی کے مقام پر واقع یہ مینار بھی مسلم حکمرانی کی ایک عظیم نشانی ہے۔

■

Mohd Qayyum Meo
A/4, Ayub Manzil Karim Nagar
PO.: Taj Ganj, Dist. Agra - 282001 (UP)

مولانا محمد مقصود عالم رضوی

حسد کی آگ

پیارے بچو! بہت پہلے کی بات ہے، بادشاہ کسریٰ کے دربار میں ایک مچھیرا مچھلی لے کر آیا۔ مچھلی کا وزن تقریباً 4 کلو تھا، کسریٰ نے مچھیرے کو انعام میں چار ہزار درھم دینے کا حکم دیا، کسریٰ کی لونڈی نے اتنے بڑے انعام کو دیتے ہوئے دیکھا تو اس سے رہا نہ گیا، کہنے لگی:

حضور! اس مچھلی کے بدلے آپ چار ہزار درھم دے رہے ہیں؟ پھر مزید کہا، آپ اس مچھیرے کو بلوائیے میں اس مچھیرے سے ایک سوال کرنا چاہتی ہوں، کسریٰ نے مچھیرے کو بلوایا۔ لونڈی نے مچھیرے سے پوچھا؟ یہ مچھلی نر ہے یا مادہ؟ لونڈی کا مقصد تھا اگر مچھیرا نر کہے گا تو میں کہوں گی، بادشاہ سلامت کے لیے مادّہ مچھلی مفید ہے، اگر مادہ کہے گا تو نر مچھلی کی خصوصیات بتا دوں گی، لیکن مچھیرے نے لونڈی کی خواہش پر پردہ ڈال دیا۔ اس نے جواب دیا۔ یہ مچھلی نہ نر ہے نہ مادہ بلکہ یہ خنثیٰ ہے، کسریٰ نے مچھیرے کے منھ سے یہ الفاظ سنے تو بادشاہ نے مزید حکم دیا کہ مچھیرے کو چار ہزار درھم مزید دے دیے جائیں، مچھیرا خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا اسی حالت میں چلتے ہوئے اس کے ہاتھ سے ایک درہم گر گیا اسے اٹھانے کے لیے زمین پر جھکا، یہ کسریٰ کے دربار اور اس کی شان کے خلاف تھا، لونڈی کو ایک بار پھر موقع مل گیا اس نے کسریٰ سے دست بستہ عرض کیا۔ حضور! ذرا دیکھیے یہ آدمی کتنا گھٹیا ہے، آپ نے اسے انعام واکرام سے اتنا مالا مال کیا اس کے باوجود بھی ایک درہم کے لیے بے ادبی پر اُتر آیا، کسریٰ نے مچھیرے کو بلا کر پوچھا ایسی گھٹیا حرکت تو نے کیوں کی، مچھیرے نے کہا، عالی جاہ! درھم پر حضور کی تصویر بنی ہے میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ بادشاہ سلامت کی تصویر زمین پر پڑی رہے اس لیے میں نے اُسے اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ کسریٰ نے جب یہ جواب سنا اور حکم جاری کیا اسے چار ہزار درھم مزید دے دیے جائیں۔ دوسری طرف لونڈی کی حالت قابل رحم تھی۔ وہ دانت پیس کر رہ گئی، کسریٰ نے لونڈی سے کہا، تم اپنی آگ میں جلتی رہو جب تک تم اپنے دل میں حسد رکھو گی سکون سے نہیں رہو گی حسد انسان کی نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ سوکھی لکڑی کو۔

■

Maulana Mohd Masood Alam Rizvi
M.Z. Azad Nagar
Behind Bohri Qabrastan
Bhusawal (Maharashtra)

آپ کا دماغ کتنا تیز ہے؟

دوستو! یہ دونوں تصویریں دیکھنے میں تو ایک جیسی لگتی ہیں لیکن تصویروں کی نقل بنانے والے سے ایک دو نہیں بلکہ دس غلطیاں ہوگئی ہیں۔ کیا آپ ان غلطیوں کو تلاش کر سکتے ہیں؟ 10 منٹ میں اگر آپ نے تمام غلطیاں تلاش کرلیں تو سمجھیے کہ واقعی آپ کا دماغ بہت تیز ہے۔

■ جوابات اسی شمارے میں تلاش کریں

ادبی لطائف

ہنسی کے غبارے

ایک مرتبہ مولانا حالی سہارنپور گئے اور وہاں کے ایک معزز رئیس زمیندار کے پاس ٹھہرے۔ گرمی کے دن تھے اور مولانا کمرے میں لیٹے ہوئے تھے۔ اسی وقت اتفاق سے ایک کسان آگیا تو رئیس نے اس سے کہا کہ جو بزرگ آرام کر رہے ہیں ان کو پنکھا جھلو۔ وہ پنکھا جھلنے لگ گیا۔

تھوڑی دیر بعد اس کسان نے رئیس سے پوچھا کہ یہ کون بزرگ ہیں۔ رئیس نے کہا، کم بخت تو ان کو نہیں جانتا یہ مولوی حالی ہیں اور سارے ہندوستان میں ان کا چرچا ہے۔ یہ سن کر وہ کسان بولا ''حضور کبھی ہالی (ہل چلانے والے) بھی مولوی ہوئے ہیں۔

مولانا حالی یہ سن کر پھڑک کر اٹھے اور رئیس سے کہنے لگے ''حضرت اس تخلص کی داد آج ملی ہے۔''

اردو کے پروفیسر گھر آئے تو بیوی سے پوچھا:

بیگم آج کیا پکایا ہے۔ مہنگائی کے ہاتھوں پریشان عورت نے جواب دیا:

خاک پکائی ہے

پروفیسر صاحب بولے:

خاک کو الٹ کریں تو کاخ بنتا ہے

کاخ فارسی میں محل کو کہتے ہیں

محل کو الٹا کریں تو لحم بنتا ہے

لحم کو عربی میں گوشت کہتے ہیں

اچھا بیگم آج گوشت پکایا ہے۔

پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار ایس پی سنگھا کے گیارہ بچوں کے نام کا آخری حصہ 'سنگھا' تھا۔ جب ان کے ہاں بارھواں لڑکا پیدا ہوا تو شوکت تھانوی سے مشورہ کیا کہ اس کا کیا نام رکھوں۔ اس پر شوکت صاحب نے بے ساختہ کہا ''آپ اس کا نام بارہ سنگھا رکھ دیجیے۔''

ایک کالج میں ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں کلیم جھنجھانوی کو کلام پڑھنے کی دعوت دی گئی۔ اسٹیج پر آتے ہی پان کی پیک تھوکنے کے لیے پیک دان طلب فرمایا وہ کہاں سے آتا۔ قبلہ نے پیک کا غرغرہ کرتے ہوئے کپکپاتی ہوئی آواز میں پہلے تو وضاحت فرمائی کہ ہمارے قصبے کا نام جھنجھانہ ہے اور ساتھ کے قصبے کا نام فدیانہ ہے اور پھر شعر سنایا:

کاش لے جائے کوئی مجھ کو تو فدیانے تک
واں سے میں خود ہی چلا جاؤں گا جھنجھانے تک

محراج الدین

کسی کا مذاق نہ اڑاؤ

صائمہ ایک ہوشیار اور پڑھائی میں دلچسپی رکھنے والی لڑکی تھی۔ ہر چھوٹے بڑے کا احترام کرتی بس ایک بات تھی جو اسے بری لگتی تھی اور پریشان ہوتی وہ تھی اس کی بدصورت شکل۔ اسکول و محلے میں جہاں وہ جاتی لوگ اس کا مذاق اڑاتے۔ صائمہ آج اسکول گئی تو اس کی ٹیچر نے کلاس میں اعلان کیا کہ کچھ دنوں بعد ہمارے اسکول میں سالانہ امتحانات کے انعامات کا ایک پروگرام ہونے والا ہے۔ اس میں ہماری کلاس کو فینسی ڈریس شو کی پرفارمنس ادا کرنی ہے۔

صائمہ کی بہترین دوست فاطمہ نے بھی فینسی ڈریس شو میں حصہ لینے کا ارادہ کیا تو اس نے صائمہ سے کہا کہ وہ بھی اس فینسی ڈریس میں شو میں حصہ لے لیکن وہ اپنی خراب شکل کی وجہ سے حصہ لینے سے انکار کرتی رہی۔ فاطمہ کے بہت اصرار کرنے پر اس نے بھی حصہ لیا۔ جب کلاس کی لڑکیوں نے یہ سنا کہ صائمہ بھی اس فینسی ڈریس شو میں حصہ لے رہی ہے تو سب نے صائمہ کا مذاق اڑایا۔ خوب طعنے دیے یہ اسٹیج پر آئے گی تو لوگ بھاگ جائیں گے۔ کسی نے کہا بچے ڈر جائیں گے۔ سب نے صائمہ کا بہت مذاق اڑایا اور صائمہ کا دل ٹوٹ گیا اور اس شو کے ہونے سے چند دن پہلے اس نے حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ جب فاطمہ کو اس بات کا پتہ چلا تو وہ کلاس میں گئی اور لڑکیوں کو سمجھایا کہ کسی کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے۔ ہم سے ہمارا خدا ناراض ہوتا ہے اور کیا تم لوگ حضورؐ کے پیغام کو بھول گئے کہ کسی کو کسی کے مقابل بہتر نہ سمجھو۔ یہ سمجھانے کے بعد فاطمہ صائمہ کے گھر گئی اور بہت غصہ ہوئی اور زبردستی اس کو حصہ لینے کے لیے رضامند کیا۔ صائمہ جب اسٹیج سے نیچے اتری تو اس کی ہم جماعت لڑکیوں نے اس سے معافی مانگی اور کہا کہ ہم نا سمجھ تھے۔ اب ہم سمجھ گئے ہیں کہ انسان کی شخصیت اس کی شکل سے نہیں بلکہ اس کے اخلاق اور اس کی محبت سے ہوتی ہے یہ سن کر صائمہ کو ایسی خوشی ہوئی کہ وہ پھولے نہ سمائی اس لیے پیارے بچو آپ بھی کبھی کسی کا مذاق نہ اڑائیں چاہے وہ کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے خلوص کی قدر کریں۔ ایسے لوگوں کو ہی خدا پسند کرتا ہے۔

■

Mehrajuddin
Post Office: Sallar (J&K)

مسکان ہارون پنجاری

کوئل کی کہانی

کڑکڑاتی سردی تھی جس کی وجہ سے کوئل کے ننھے بچّوں کو نیند نہیں آرہی تھی تو انھوں نے اپنی ماں کو جگایا۔''ماں ماں! ہمیں نیند نہیں آرہی ہے۔ہمیں جلدی سے اپنے پروں میں لے کر کوئی اچھی سی کہانی سناؤ نا۔'' کوئل نے بہانا بنایا ''دیکھو بچوں رات کتنی ہوچکی ہے اور پھر مجھے تمھارے لیے صبح جلدی سے اُٹھ کر تمھارے لیے کھانا بھی لینے جانا ہے۔'' بچے فوراً بول پڑے ''نہیں نہیں ماں، آج کوئی بہانا نہیں۔آج ہم سب آپ سے کہانی سن کر ہی رہیں گے۔سامنے جامن کے پیڑ پر چڑیا خالہ اپنے بچوں کو روز روز نئی کہانی سناتی ہے۔'' ٹھیک ہے بھئی! میں آج تم سب کو ایک مزیدار کہانی سناؤں گی۔کوئل کی بات کاٹ کر بچوں نے کہا ہاں، لیکن ''انسان والے بھوت '' کی کہانی۔کوئل نے ٹھیک ہے چلو آج انسان والے بھوت کی کہانی سنتے ہیں۔

برفیلے پہاڑوں سے گھرا ہوا سفیدی میں نہایا ہوا ایک نہایت دلکش وخوبصورت گاؤں تھا۔ایسا لگتا تھا جیسے یہ کسی زمین کا نہیں بلکہ جنّت کا ٹکڑا ہے۔وہاں بہت سارے لمبے لمبے اور گھنے سایہ دار درخت بھی تھے۔کوئل کے بچوں نے بیچ میں کہا: ''ماں! پھر تو وہاں ہمارے رشتہ دار بھی رہتے ہوں گے نا؟'' جواب ملا ہاں پھر! وہاں ہمارے رنگ برنگی اور بڑے خوب صورت جسم والے پرندے رشتہ دار بھی تھے جن کے وجود سے اس گاؤں کی خوبصورتی میں چار چاند لگ گئے تھے۔اتنے میں سب سے چھوٹا چمپو بولا: ''امّی دان....'' کوئل نے اسے خاموش کرتے ہوئے کہا: ''بس کرو چمپو، دیکھو اگر تم بیچ بیچ میں بولتے رہے تو کہانی تو پوری نہیں ہوگی لیکن رات پوری ہوجائے گی۔پھر مت کہنا کہ میں نے کہانی پوری نہیں کی۔'' چمپو نے اپنی غلطی پر شرمندگی سے کہا: ''چھولی امّی دان۔'' کوئل نے پھر تان چھیڑی۔ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی؟ بچے بولے: ''پہاڑوں سے گھرے گاؤں میں۔'' کوئل ہنس کر بولی ہاں ہاں! اس گاؤں میں سب لوگ بڑے ہی خوش حال تھے اور مل جل کر رہتے تھے۔لڑائی جھگڑا اسے تو بالکل ہی ناواقف تھے۔

لیکن بچوں آپ کو پتہ ہے رات ہوتے ہی وہاں کے سارے لوگ اپنے گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں بند کرکے سوجاتے تھے وہ کوئی شورشرابہ نہیں کرتے تھے اور صبح ہوتے ہی اپنے کام پر چلے جاتے تھے۔یہ ان کا روز کا معمول تھا۔اندھیرا ہونے سے پہلے ہی گھر لوٹ آتے۔ایک بچے نے پھر سوال کیا: ''ماں وہ ایسا کیوں کرتے تھے؟ کیا ان کو بھی ہماری طرح اندھیرے سے ڈر لگتا تھا؟'' ''نہیں نہیں! میرے پیارے بیٹے۔ بلکہ جتنا خوبصورت وہ گاؤں تھا اندھیرا ہوتے

ہی وہ اس سے زیادہ خوفناک نظر آتا تھا اور اکثر منگل کے روز تو بہت زیادہ۔ جس سے لوگ بہت ڈرتے تھے۔ لیکن بیٹا! اس گاؤں سے تھوڑی ہی دور ندی کے کنارے پر ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی جس میں ایک ماں اور اس کا ایک بیٹا رہتے تھے۔ چمپو نے پھر گستاخی کی اور پوچھا: ''لیکن امّی دان! وہ دونوں داؤں تے اندل تیوں نئی لہتے تھے؟'' کیونکہ وہاں عاقب کے ابّا کی قبر تھی۔ وہ ایک حادثے میں انتقال کر گئے تھے اس لیے انھوں نے اپنا جھونپڑا وہیں بنا لیا تاکہ عاقب کے ابّا کی یاد تازہ رہے۔ عاقب اور اس کی ماں دونوں ایک خوشحال خاندان کی طرح زندگی گزار رہے تھے۔ عاقب اپنی ماں کا بہت فرمانبردار بیٹا تھا اور اپنی ماں کا بہت خیال رکھتا تھا۔ چمپو نے کہا: ''جیتے ہم آپ تا تھیاں لتتے ہے۔'' کوئل ہنسی اور کہانی آگے چل پڑی۔ ہاں ہاں ویسے ہی۔ لیکن ان سب کو یہ معلوم نہ تھا یہ خوبصورت گاؤں رات میں بھیانک جنگل کیوں بن جاتا ہے؟

ایک مرتبہ عاقب کی ماں کی طبیعت خراب ہوگئی۔ اب عاقب بہت پریشان ہوگیا تبھی اسے حکیم بابا کی یاد آئی۔ اس نے جلدی سے اپنی ماں سے اجازت لی اور حکیم صاحب کو بلانے کے لیے ان کے گھر گیا وہ شام کا وقت تھا اور دن بھی وہی منگل کا۔ اب سارے بچوں پر سنّاٹا چھایا۔ ایک نے ہمت کر کے سنّاٹے کو توڑا اور کہا: ''پھر بھی عاقب رات میں باہر نکلا؟'' کوئل نے بتایا نہیں نہیں بلکہ وہ جوان اور پھرتیلا تھا۔ بہت تیز دوڑ کر شام ڈھلنے سے پہلے ہی گاؤں میں داخل ہوگیا اور سیدھے حکیم صاحب کے مکان کے پاس کھڑا ہوگیا۔ دستک دی۔ حکیم بابا نے آواز پہچان کر دروازہ کھولا اور جلدی سے عاقب کو گھر کے اندر کھینچا۔ کوئل کی بیٹی بولی: ''کیوں کھینچا ماں؟'' ارے تم بھول گئے منگل کا دن تھا نا اور شام ڈھلنے لگی تھی اندھیرا ہونے لگا تھا۔ جس کی وجہ گاؤں والے گھروں میں چلے گئے تھے اور ان کی سانس لینے کی بھی آواز نہیں آرہی تھی۔ اس لیے عاقب کو حکیم بابا نے اندر جلدی سے کھینچا۔ اور پوچھنے لگے: ''تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟ تمھیں معلوم نہیں کہ اگر تمھیں آنے میں تھوڑی سی دیر ہو جاتی تو تمھارے ساتھ کیا ہوتا؟''

پیارے بچوں! ایک بار ایسا ہوا تھا کہ حکیم بابا جری بوٹی لینے جنگل میں عاقب کے گھر کی طرف آئے۔ عاقب کھیلنے میں مصروف تھا حکیم بابا نے ایک درخت کے نیچے جڑی بوٹی چننا شروع کردی کہ اتنے میں ایک سانپ حکیم بابا کے سر کے اوپر لہرا رہا تھا۔ عاقب نے دیکھا فوراً دوڑ کر اس نے حکیم بابا کو وہاں سے ہٹا لیا اور سانپ کو دور پھینک دیا جس سے حکیم بابا کی جان بچ گئی۔ کوئل کا دوسرا بیٹا ٹمپو بہت خاموش بیٹھا تھا۔ کوئل نے اسے دیکھ کر کہا کیا بات ہے ٹمپو! تم اتنے خاموش کیوں ہو؟ ٹمپو نے کہا: ''ماں مجھے یہ سمجھ میں نہیں آرہا یہ حکیم بابا کیا ہوتا ہے؟'' ارے بیٹا! دیکھو چمپو کی سردی، پمپو کی کھانسی اور چڑیا خالہ کے بیٹے کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کس نے ٹھیک کی؟ ٹمپو بولا: ''اُلّو دادا جی نے'' ہاں تو ہم سب اُلّو دادا کو کیا کہتے ہیں؟ حکیم دادا۔ ہاں، اچھا میں سمجھ گیا۔ ٹمپو نے کہا۔ اب کہانی پھر شروع ہوئی۔

حکیم بابا نے عاقب کو گھر میں لے لیا تھا۔ اب پورا گاؤں خاردار جنگل میں بدل گیا تھا۔ آسمان پر کالی کالی گھٹائیں چھا گئیں تھی۔ لو بجلیاں بھی چمکنے لگیں۔ ہوا بھی چلنے لگی۔ لمبے گھنے درختوں سے ٹکرا کر ہوا سائیں سائیں کی آواز کر رہی تھی۔ اسی بیچ کوئل پریشانی سے ادھر اُدھر دیکھنے لگی کہ یہاں ررررر..... تھ..... تھ...... تھر........ہ........ہن..... کی آواز کہاں سے آنے لگی؟ معلوم ہوا کہ یہ بچوں کے منہ سے نکلنے والی آواز تھی۔ کوئل ہنسنے لگی۔ بچوں

نے پوچھا امی آپ کیوں ہنس رہی ہو؟ ارے پیارے بچوں تم تو صرف ایک کہانی سے ڈر نے لگے۔ بچوں نے اپنی ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا: ''نہیں نہیں! ہم تھوڑے ہی ڈرتے ہیں آپ سناؤ۔'' ٹھیک ہے کوئل نے کہانی پھر شروع کی، ۔۔۔پھر اسی درمیان کالے کالے لمبے بال، کالا کالا منہ اور لال ساڑی پہنے، بڑے بڑے ناخن اور سفید آنکھ والی عورت درخت کے قریب بیٹھی زور زور سے رونے لگی۔ جیسے جیسے وہ روتی اچانک سے زور کی ہوائیں چلنے لگیں اور ہر طرف دھواں پھیل گیا بیچ بیچ میں طرح طرح کی خوفناک آوازیں سنائی پڑتی یہ سب دیکھ کر بھی عاقب بالکل نہیں ڈرا کیونکہ رات تقریباً آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی اور اس کی ماں گھر پر بخار میں تڑپ رہی تھی۔ ماں کا خیال آتے ہی اس نے حکیم بابا سے مِنّت کرتے ہوئے کہا: ''آپ جلدی سے میرے ساتھ میرے گھر چلیے ورنہ اگر تھوڑی بھی دیر ہوگئی تو میری ماں .... '' اتنا کہہ کر وہ رونے لگا۔ یہ دیکھ کر حکیم بابا کی آنکھیں بھی بھر آئیں اور انھوں نے اپنی جھونپڑی میں موجود جڑی بوٹی کی تھیلی لی اور عاقب کا ہاتھ تھام کر دروازہ کھولا۔ دروازہ کھولتے ہی اس عورت نے انھیں دیکھ لیا۔ ہر طرف سناٹا اور بالکل خاموشی چھا گئی۔ کوئل کے بچے نے کہا: ''ماں یہ تو بہت خطرناک عورت ہے نا؟ وہ تو ان دونوں کو مار ہی ڈالے گی۔'' نہیں نہیں بیٹا! وہاں کوئی جنگ تھوڑی ہو رہی تھی وہاں تو ایک بیٹے اور اس کی ماں کی محبت اور پیار تھا جس کے درمیان ایسی ہزار عورتیں بھی حائل ہوجاتیں تو وہ عاقب کا مقابل نہیں کر سکتی تھیں۔

کوئل نے کہانی کو آگے بڑھانا شروع کیا۔ وہ عورت جیسے جیسے ان کے قریب آنے لگی ویسے ویسے ہوائیں تیزی سے چلنے لگیں مگر یہ دونوں بغیر گھبرائے آیۃ الکرسی کا وِرد کرتے چلتے ہی رہے۔ وہ اتنی زور سے آیۃ الکرسی پڑھتے کہ عورت ان کے قریب نہیں آنے پاتی۔ لوگ ان کی زبان سے آیۃ الکرسی کا ورد سن کر باہر آئے اور وہ بھی آیۃ الکرسی پڑھنے لگے۔ جس کی وجہ سے وہ عورت غائب ہوگئی اور اس گاؤں کے لوگوں نے پہلی بار رات کے وقت آسمان کو دیکھا، چاند ستاروں کی چمک اور ایسی خوبصورتی سے محظوظ ہوئے جو دن میں انھیں کبھی دیکھنے کو نہیں ملی تھی۔

ادھر عاقب اپنی ماں کی شفاء کے لیے رو رو کر دعائیں مانگتا جا رہا تھا۔ جیسے تیسے وہ حکیم بابا کو لے کر اپنے گھر پہنچا، حکیم بابا نے فوراً بیماری کی تشخیص کر کے اپنی تھیلی سے جڑی بوٹیاں نکال کر عاقب کی ماں کے منہ میں اُنڈھیلی اور تھوڑی ہی دیر میں اس کی ماں کو ہوش آ گیا اور عاقب اپنی ماں سے لپٹ گیا۔

کوئل نے دیکھا کہ اس کے بچے رو رہے تھے تو اس نے اپنے بچوں سے پوچھا: ''بچوں! تمھاری خوبصورت آنکھوں میں یہ ننھے ننھے آنسو کس لیے؟'' بچے بولے: ''امی جان! عاقب نے اپنی ماں کے لیے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر سارے جوکھم مول لیے، جہاں رات میں لوگوں کی سانس کی آواز بھی نہیں آتی تھی وہاں وہ اکیلا ہی گیا اور ایک خطرناک مہم میں کامیاب ہوا اور ایک ہم ہیں کہ صرف کہانی سننے کی ضد میں ہم نے آپ کی نیند حرام کر دی۔'' کوئل نے اپنے بچوں کو اپنے پروں میں سمو کر کہا: ''ارے ارے! کوئی بات نہیں میرے پیارے بچوں۔ اب جلدی سے آنسو پونچھو۔ بس ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، اگر تم کسی نیک کام کو کرو تو اللہ تعالیٰ ہمیشہ تمھاری مدد فرمائے گا اور تمھیں ہر مشکل میں کامیاب کرے گا۔''

■

Muskan Haroon Pinjari
Class X, Millat High School
Mahroon Jalgoan (Maharashtra)

رالیہ فردوس ابوحافظ، زیڈ پی اردو اپر پرائمری اسکول اچل پور، امراؤتی

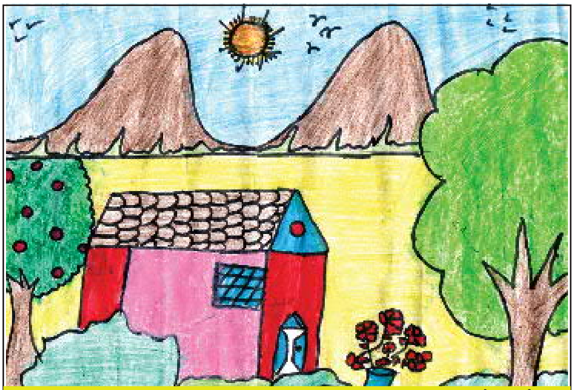

شیخ عمر شیخ عارف، درجہ ہفتم، نگر پریشد اردو مڈل، اسکول، نندور، مہاراشٹر

نوشین پروین، ولاس راؤ دیشمکھ اردو ہائی اسکول انٹر، ضلع پربھنی، مہاراشٹر

الفیہ پروین شیخ بسم اللہ، درجہ ہفتم، نگر پریشد اردو مڈل، اسکول، نندور، مہاراشٹر

عرشیہ عقیل کھاتک، شیخ امام پرائمری اسکول، مالیگاؤں، مہاراشٹر

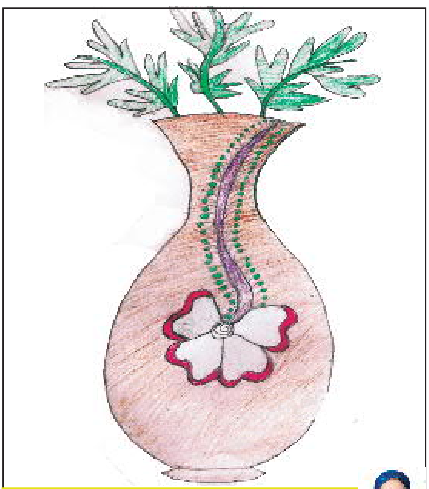

ماریہ بانو اشتیاق احمد، ذکریا گھاڑی اردو پرائمری اسکول، دھوبیہ

صوفی سیف احمد، درجہ دوم، پریس اکادمی، اورنگ آباد، مہاراشٹر

محمد مصدق شفیق احمد، مکان نمبر 161/2، شفیع آباد، مالیگاؤں، ضلع ناسک، مہاراشٹر

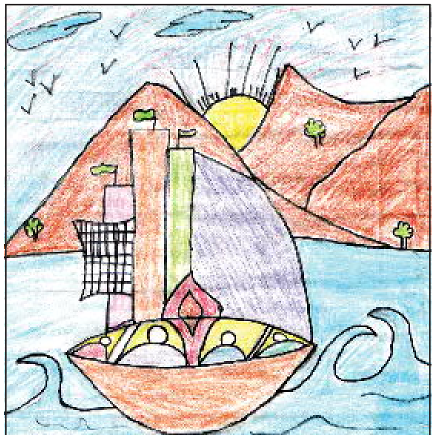

عائمہ پروین قیوم خان، درجہ ہفتم،
نگر پریشد اردو مڈل، اسکول، نندور، مہاراشٹر

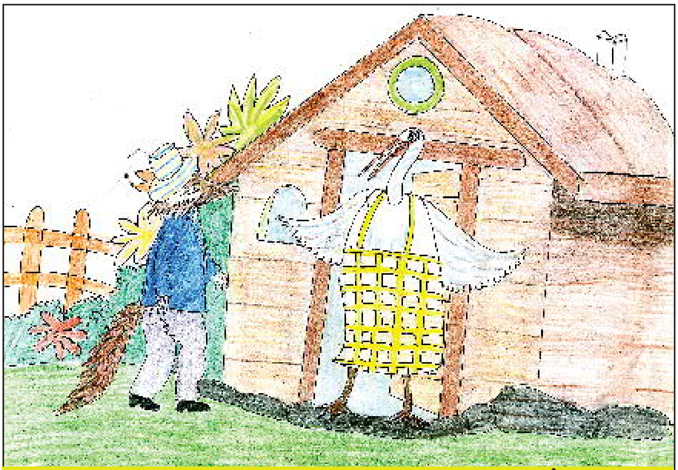

رضوان شیخ یونس، درجہ ششم، زیڈ پی اردو اسکول، سبھاش نگر، شیر پور، ضلع دھولے

رانی بی افضل لوہار، درجہ ہشتم، زیڈ پی اردو اسکول، سبھاش نگر، شیر پور، ضلع دھولے

فرحین کوثر اشفاق احمد، درجہ دہم،
شفیع آباد، مالیگاؤں، ناسک، مہاراشٹر

Facebook اردو فیس بک

ہر ماہ 'بچوں کی دنیا' گھر آتے ہی میرا چھوٹا بھائی عاطف سب سے پہلے لپک لیتا ہے حالانکہ اسے اردو روانی سے پڑھنا نہیں آتا، لیکن 'بچوں کی دنیا' کے اوراق و تصاویر اتنے دلکش و رنگین ہوتے ہیں کہ وہ گھنٹوں بیٹھا ورق گردانی کرتا رہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی تصویر بھی 'بچوں کی دنیا' میں شامل ہو اس لیے اس کی تصویر بھیج رہی ہوں۔

شاہین صدف زاہد انور، جماعت ہشتم، گرلس ہائی اسکول، ناسک، مہاراشٹر

'بچوں کی دنیا' بہت اچھا رسالہ ہے۔ پڑھ کر میری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔

مقصود قاسم ناچرے، درجہ پنجم، ضلع پریشد اردو اسکول پاچل، رتناگیری

میں 'بچوں کی دنیا' کا ہر مہینے مطالعہ کرتی ہوں۔ میرے ابو میرے لیے گل بوٹے، پیام تعلیم، امنگ کے ساتھ 'بچوں کی دنیا' بھی لاتے ہیں اور میں سبھی رسالوں کو ہر ماہ پابندی سے پڑھتی ہوں۔ 'بچوں کی دنیا' کی کہانیاں اور نظمیں مجھے بہت پسند ہیں۔

کرینہ حسین نائیک، درجہ: چہارم، ضلع پریشد اردو اسکول پاچل، رتناگیری

مجھے 'بچوں کی دنیا' پڑھنا بہت پسند ہے۔ ہر ماہ 'بچوں کی دنیا' کا بے صبری سے انتظار کرتا ہوں۔ مجھے اس کی کہانیاں، لطیفے، کہکشاں اور چمن چمن کے پھول بھی بہت پسند ہیں۔

محمد مہران خان سلیم خان، درجہ: نہم، بہادر شاہ ظفر اردو ہائی اسکول، بھساول

انکل جی آداب! میرا نام محمد اسعد ہے۔ مجھے اردو زبان سے بہت لگاؤ ہے۔ میرے پاس ہر ماہ کی 'بچوں کی دنیا' موجود ہے۔ 'بچوں کی دنیا' کا ہر مہینے میں بے صبری سے انتظار کرتا ہوں۔ مجھے 'بچوں کی دنیا' بہت پسند ہے کیونکہ اس کا ہر صفحہ رنگین ہے۔

محمد اسعد مقصود احمد، ملت نگر، ایس ایم خلیل ہائی اسکول، مالیگاؤں، مہاراشٹرا

میرا نام قاضی محمد سعد ہے۔ میں آر۔ سی۔ پٹیل اردو پرائمری اسکول، شیر پور میں جماعت دوم کا طالب علم ہوں۔ مجھے 'بچوں کی دنیا' میں کالم ننھے فنکار بہت اچھا لگتا ہے جس میں اچھی اچھی ڈرائنگ ہوتی ہے۔ 'بچوں کی دنیا' میں ہم ننھے ننھے بچوں کے لیے خوب صورت نظمیں اور ہر کہانیاں ہوتی ہیں۔ ہمارے اسکول میں یہ رسالہ ماہ پابندی سے آتا ہے اور تمام بچے بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔

قاضی محمد سعد نوید اقبال، قاضی محلہ، شیر پور، ضلع دھولے

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

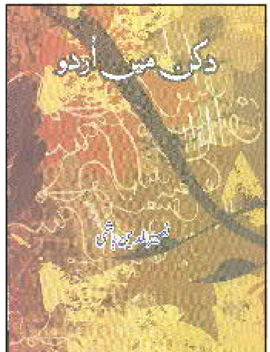

صفحات: 945، قیمت: 325 روپے

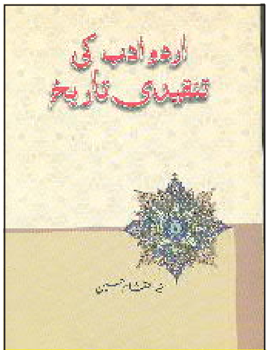

صفحات: 341، قیمت: 100 روپے

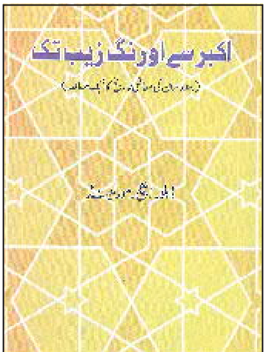

صفحات: 420، قیمت: 185 روپے

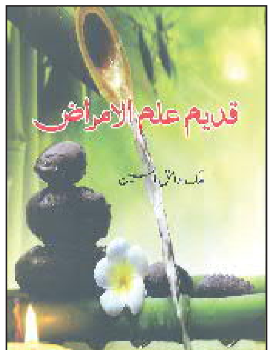

صفحات: 131، قیمت: 40 روپے

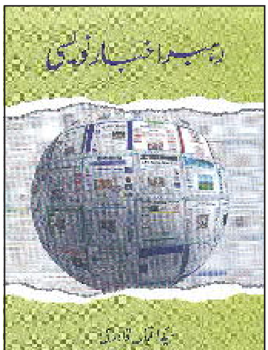

صفحات: 751، قیمت: 260 روپے

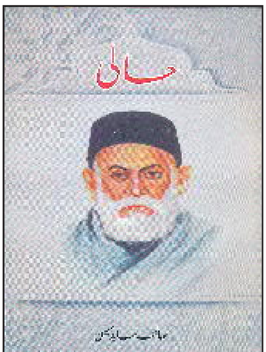

صفحات: 68، قیمت: 20 روپے

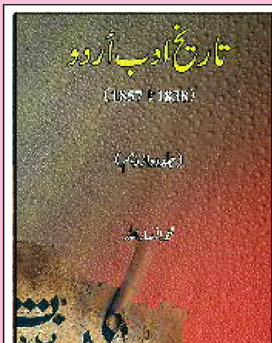

صفحات: 572، قیمت 243 روپے

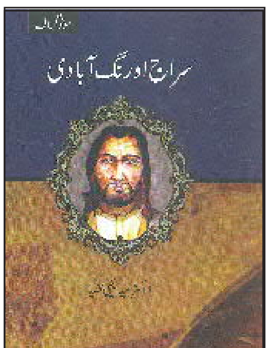

صفحات: 129، قیمت: 78 روپے

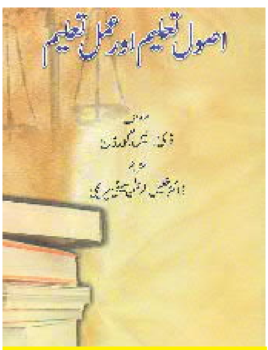

صفحات: 330، قیمت: 55 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

BACHON KI DUNIYA Monthly, October 2016, Vol. 04, Issue: 10
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL(S) - 01/3439-2016-18
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/09/16
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دلچسپ کتابیں

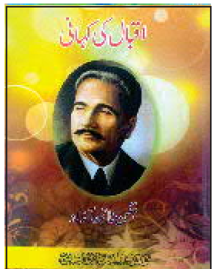

صفحات: 63، قیمت: 16 روپے

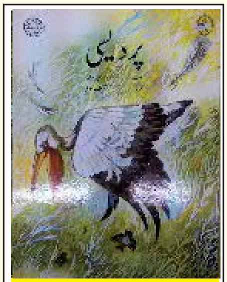

صفحات: 64، قیمت: 19 روپے

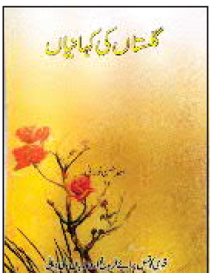

صفحات: 67، قیمت: روپے

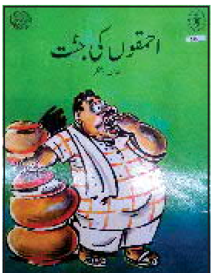

صفحات: 48، قیمت: 16 روپے

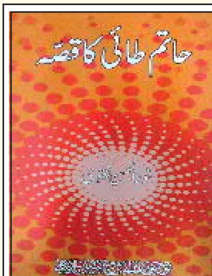

صفحات: 22، قیمت: 22 روپے

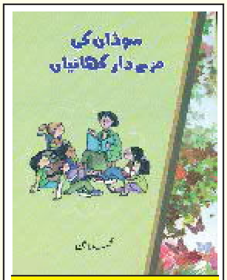

صفحات: [illegible]، قیمت: 20 روپے

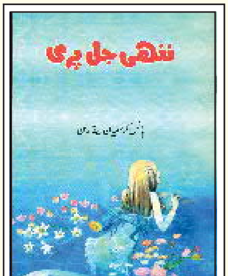

صفحات: [illegible]، قیمت: 16 روپے

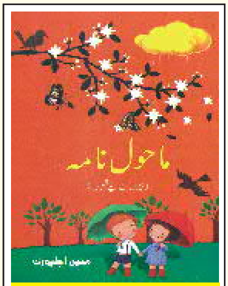

صفحات: 82، قیمت: [illegible] روپے

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S. Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II, New Delhi - 110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi -110025.